تصوّف اور ادب

کا

باہمی رشتہ

ڈاکٹر نفیس اقبال

297.6
ن 73 ت
144682

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

Marfat.com

تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ

تحقیقی و تنقیدی مقالات

ڈاکٹر نفیس اقبال

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں
پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، لاہور

ISBN: 978-969-8460-24-2

طبع اوّل	2012
مصنفہ	ڈاکٹر نفیس اقبال
سرِ ورق	محمد جاوید
قیمت	225.00 روپے

ناشر
پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی
70-شاہراہ قائداعظم، لاہور

تقسیم کار
کواپرا بک سنٹر اینڈ آرٹ گیلری
70-شاہراہ قائداعظم، لاہور
فون: 0092-42-37321161 / 37322926
e-mail: info@cooperaartgallery.com

طابع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

Marfat.com

انتساب

محمد حسن سلطان کے نام

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

	صفحہ نمبر
پیش لفظ	1
تعارف	3
تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ	9
سلسلۂ قادریہ اور تعلیمات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	19
روحانی دانشور: حضرت امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب	33
صوفیائے کرام کی لسانی خدمات	59
حضرت میاں میرؒ کے عہد کا متصوفانہ ادب	87
حضرت نظام الدین اولیاؒ : افکار و اثرات	105
تصوُّف: بیسویں صدی کے دانشوروں کی نظر میں	119
کشف المحجوب کی اہمیت	133
رسالہ غوث الاعظمؒ مع شروحات اور مکتوباتِ عشق	143
سیر الاولیا: صوفیائے پاک و ہند کا پہلا تذکرہ	145
تحقیق العارفین: سلسلۂ قادریہ جلویہ کی نادر کتاب	157
حضرت امام جلویؒ کے صوفیانہ اُردو خطوط	163
صوفی عطاؒ محمد قادری کے صوفیانہ تراجم	173
مقدمہ اسرار القِدم مِن فصوص الحکم	183
ایک صوفی فرمانروا	191

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

کچھ لوگ تصوُّف کو ادب کا موضوع نہیں سمجھتے۔ اُن کے خیال میں ادب کا تعلق جمالیات اور تخلیق سے ہے اور تصوُّف کا تعلق صرف مذہب اور دین سے ہے۔ حالانکہ تصوُّف اخلاقیات کا حامل ہے اور اخلاق جمال ہی کا روپ ہے اور جمال تخلیق کی بنیاد ہوتا ہے۔ مثبت اقدار جمال کی ایک شکل ہیں اور اُن کو فروغ دینا جمالیات کو فروغ دینا ہے۔ تخلیقی زندگی محض شعر و ادب نہیں بلکہ وہ زندگی ہے جس میں عقل و حسن، انصاف و محبت کی مثبت اقدار ہوں۔ مثبت اقدار زندگی کی خوبصورتی کی ضامن ہیں اور یہ اقدار تصوُّف میں تعلیم و تربیت کا حصہ ہیں۔ کائنات کا وصف خیر ہے اور خیر کے ادراک کے بغیر زندگی بدشکل اور بنجر بن جاتی ہے۔ تصوُّف اِسی خیر کی جانب متوجہ کرتا ہے۔

وسعتِ قلب و نظر کے بغیر تخلیق کا کام نہیں ہوسکتا اور یہ وسعتِ قلب و نظر تصوُّف کی بے تعصبی اور رواداری کا حصہ ہے۔ تخلیق کے عمل میں جس مکمل ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ارتکاز صوفی شاعر اور مصنف کی زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ صوفی کے باطنی ربط کی وجہ سے اس کا تجزیہ زیادہ وسعت رکھتا ہے اور اس کا بیان جامعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی مثال صوفیانہ مکاتیب اور ملفوظات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ مذکورہ صورتِ حال کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تصوُّف کو اُردو ادب سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اُردو کے اوّلین شعرا و مصنفین خود صوفی تھے اور تصوُّف اُس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا۔ بہمنی سلطنت دکن میں اُردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھی اور اس سلطنت کی تشکیل میں صوفیانہ روایات کا مؤثر کردار تھا۔ ویسے بھی آرٹ کی سمجھ صرف اُس شخص کو ہوتی ہے جو اپنے نفس کی گہرائیوں سے واقف ہو اور صوفی کے سوا کون اپنے نفس کے

Marfat.com

نہاں خانوں سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

موجودہ دور خالقِ کائنات سے قلبی بے تعلقی اور مادّہ پرستی کی وجہ سے ایک پاگل خانہ کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ایسے ماحول میں جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ ہمیں روحانی صحت کی بھی سخت ضرورت ہے ورنہ انسانی ترقی کا دعویٰ غلط ثابت ہوگا۔ اسی روحانی یا اندرونی اصلاح کے متعلقات کو روحانیت یا تصوف کہا جاتا ہے۔ تصوف جبلّت کو با اخلاق بنا کر جذبوں کی تہذیب کا اہتمام کرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب متصوفانہ ادب کی حامل ہے اور قدیم و جدید صوفیہ کے اُردو تراجم، اُردو خطوط، ملفوظات اور صوفیانہ افکار و تعلیمات کو پیش کرتی ہے۔ صوفیانہ ادب پر مشتمل زیرِ نظر کتاب میں بیسویں صدی کے حوالے سے دو اہم روحانی دانشوروں کا ذکر ہے۔ ایک حضرت امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب اور دوسرے صوفی عطا محمد قادریؒ ہیں۔ حضرت امام جلویؒ کے حوالے سے تین مضامین ہیں، ایک تفصیلی مضمون اُن کی حیات و تصانیف کے بارے میں ہے، دُوسرا اُن کے اُردو خطوط اور تیسرا اُن کی کتاب ''تحقیق العارفین'' کے بارے میں ہے۔ صوفی عطا محمد قادریؒ کے حوالے سے دو مضامین ہیں، ایک اُن کے صوفیانہ اُردو تراجم کے بارے میں اور دوسرا مضمون اُن کی مشہور کتاب ''اسرار القدم من فصوص الحکم'' کا مقدمہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں تصوُّف کی مشہور کتب اور رسائل کے متعلق بھی معلومات ہیں۔

اُمید کی جاتی ہے کہ ''بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر'' کے مقولے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب صوفیانہ ادب میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر نفیس اقبال

۲۰/اپریل ۲۰۱۱ء

Marfat.com

تعارف

یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اس دور میں اردو تحقیق زوال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اگر چہ ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ہماری دانش گاہیں ایک بڑی تعداد میں جاری کر رہی ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ محققین کی تعداد بڑھ رہی ہے اور تحقیق کا معیار بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل یہ کام زیادہ تر ان ڈگریوں کے حصول کے لیے کر رہی ہے۔ مگر اس دور میں بھی ہماری دانش گاہوں کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو نہایت اخلاص اور سنجیدہ علمی جستجو کے ساتھ اپنے تحقیقی کاموں میں شب و روز مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ان ہی محققین میں ڈاکٹر نفیس اقبال کا نام بھی آتا ہے۔ اردو شاعری میں تصوف کے موضوع پر اُن کا تحقیقی مقالہ اپنی نوعیت کا گراں قدر کام ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور عالمانہ لگن کے ساتھ تصوف کے نظریے، تصوف کی تاریخ اور اردو شاعری میں تصوف کے مسائل کی شعری تشکیل پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو شاعری میں تصوف کی تاریخ، اس کے مختلف ادوار اور نمائندہ صوفی شاعروں پر ان کے تجزیے قابل داد ہیں۔۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ برصغیر پاک و ہند میں وہ واحد سکالر ہیں کہ جن کی توجہ خصوصی طور پر تصوف پر مرکوز رہی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مرتب شدہ کتاب ''اسرار القدم من شرح فصوص الحکم'' کا مقدمہ خصوصاً قابل ذکر ہے۔ تصوف کے مباحث اور مسائل کو انھوں نے کمال سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک حالیہ کتاب ''ابدیت کے تناظر سے تصوف کے مختلف پہلوؤں کا علمی و فکری مطالعہ'' اس سلسلہ کی نمایاں کڑی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے صوفی علما اور ان کے علمی کاموں کا جائزہ لیا ہے۔ جنیدِ بغداد سے شروع ہونے والے مباحث سے لے کر یہ سلسلہ جدید دور کی ایک بہت اہم علمی شخصیت پروفیسر شمل کے افکار تک پہنچا ہے۔ اردو

Marfat.com

ادب میں اس قسم کی کتابوں کی بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس پر پورا اترتی ہے۔

ڈاکٹر نفیس اقبال برصغیر کی واحد دانش ور خاتون ہیں جو عہدِ جدید کی مادہ پرستی کے اس دور میں بھی تصوف اور تصوف کے مسائل اور افکار پر تسلسل کے ساتھ مضامین اور کتابیں لکھتی رہی ہیں۔ پاکستان ان دنوں ایک طرف مادہ پرستی کی بدترین صورتوں کا شکار ہے اور دوسری طرف زوال پسند بنیاد پرستی، مذہبی گروہوں کی دہشت گردی اور مذہب کی محدود اور غیر معتبر تعبیر کے باعث خوف ناک مسائل میں اسیر ہے۔ انسان کی حرمت، عظمت اور اس کے احترام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ایسے الم ناک حالات میں مذہب کی روشن خیال تفسیر و تعبیر، بہتر سماجی نظام، بہتر اقتصادیات اور اس کے ساتھ ساتھ صدیوں پرانی تصوف کی انسان دوست روایت اس ملک کی تعمیرِ نو میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر نفیس اقبال کے مضامین کی یہ تازہ کتاب ہمارے سامنے تصوف کی اسی روایت کو پیش کرتی ہے جس سے برِصغیر کی فضا صدیوں تک منور رہی تھی۔ ہمیں ان مضامین کو اسی منظر نامے کے حوالے سے پڑھنا چاہیے۔

تبسم کاشمیری

جی سی یونیورسٹی، لاہور

9 جولائی، 2011ء

پاکستانی یونیورسٹیوں میں اردو ادب میں ایم فِل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق اور تدوین کی تعلیم کے آغاز کا ایک اثر تنقید پر بھی پڑا ہے۔ عام طور پر سمجھا جانے لگا ہے کہ تنقید اور تحقیق دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ یہ تصور اصل میں یونیورسٹیوں میں قدرتی علوم اور سائنسز پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ ہے۔ یہ بات نظر انداز کر دی گئی ہے کہ علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: افادی اور اقداری۔ افادی علوم جن میں نیچرل اور سوشل سائنسز شامل ہیں، ان میں ریسرچ اور سروے ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ صرف مظاہر کے اس پہلو سے تعلق رکھتی ہیں کہ ''کیا ہے؟ کیسے ہے؟ یا کیوں ہے؟'' اور یہ تحقیق لیبارٹریوں اور دیگر متعین جگہوں میں ہوتی ہے۔ جبکہ علوم کا ایک شعبہ ان

Marfat.com

مطالعات پر مشتمل ہے جنھیں اقداری کہا جا سکتا ہے جس میں فنونِ لطیفہ اور فلسفہ شامل ہیں۔ یہ علوم کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے ساتھ ساتھ معیار کا سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کیا ہونا چاہیے؟ اور کیسا ہونا چاہیے، اصل میں یہ ایسے سوال ہیں جو فلسفے اور تنقید کے دائرۂ عمل میں ہیں لہٰذا ان علوم میں تحقیق کو اگر چہ بہت اہمیت حاصل ہے لیکن وہ تنقید کا ہی ایک اولین اور لازمی حصہ ہے۔

تحقیق پر اصرار کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ محققین اور ناقدین نے ادب کے مخفی یا نظر انداز پہلوؤں پر بھی توجہ دینا شروع کر دی ہے اور اس کے نئے نئے گوشے ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نفیس اقبال اس کی ایک عمدہ مثال ہیں جنھوں نے تحقیق اور تنقید کے مروج اور قبول عام راستوں کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے گیت نگاری پر توجہ دی جو ہمارے ادب ہی نہیں، کلچر، تہذیب اور تمدن کا بھی ایک حصہ ہے اور ہماری زندگیوں کی بہت سی خوشیوں کا اس پر دار و مدار ہے۔ ان کی کتاب ''پاکستان میں اردو گیت نگاری'' اس کاوش کا عمدہ نمونہ ہے جس میں انھوں نے گیت نگاری کے فن، موضوعات اور روایات کا جائزہ لیا۔ یہ پاکستان میں گیت نگاری کی روایت کا ایسا مطالعہ ہے جس میں تحقیق اور تنقید کے امتزاج سے موضوع کا جائزہ لے کر ایک مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب اس موضوع پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتب میں اولین مقام رکھتی ہے۔

بعد ازاں انھوں نے تصوف کی طرف توجہ کی ہے۔ ڈاکٹر نفیس اقبال کا ایک بڑا کارنامہ تصوف اور اس کی روایت کی تاریخ اور تنقید و تحقیق کی پیش کش ہے۔ انھوں نے متعدد تحریروں اور کتب میں اس موضوع کی وسعت اور گہرائی کا جائزہ لیا ہے۔ اس موضوع کے لیے ڈاکٹر نفیس اقبال شاید بہت موزوں سکالر ہیں کیونکہ تصوف ان کی وراثت اور میراث کا حصہ ہے۔ ان کے والد محترم جناب عطا محمد قادری صاحب ایک باعلم اور باعمل صوفی تھے جو کہ پیر غلام محمد امام جلوی کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے ''اسرار القدم'' کے نام سے ''فصوص الحکم'' کا نہایت رواں اور مقبول اردو ترجمہ کیا ہے جسے ڈاکٹر نفیس اقبال نے تعارفی مقدمے کے ساتھ دوبارہ شائع کرایا ہے۔ ڈاکٹر نفیس اقبال نے تصوف کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا ''اردو شاعری میں تصوف۔ میر، سودا اور درد کے عہد میں'' ان کا ایک وقیع مقالہ ہے جس میں انھوں نے وسیع حوالوں

Marfat.com

کے ساتھ اپنے موضوع کو نہایت مرتب طریقے سے پیش کیا ہے۔اس مقالے پر انھیں لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر نفیس اقبال کی ایک اہم پیش کش ان کی کتاب ''ابدیت کے تناظر سے'' ہے جس میں انھوں نے تصوف کے مختلف پہلوؤں کا علمی اور فکری نقطہ نظر سے جائزہ پیش کیا ہے۔اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ جائزہ اپنی مثال آپ ہے۔ڈاکٹر نفیس اقبال کا خیال ہے کہ تصوف ایک ابدی دانش ہے جو تمام مظاہر میں ازلی اور ابدی طریق سے شامل ہے اور اس کا رشتہ ابدیت سے ہے، یہ انسانی فطرت میں روزِ ازل سے موجود ہے۔اس کتاب میں انھوں نے عظیم اور مشہور صوفیا کی تعلیمات اور افکار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ابدی حقیقتوں سے رشتہ جوڑنے والی ہستیوں کی زندگی، تعلیمات، ملفوظات اور خطوط پر مبنی مضامین سے مزین ہے۔اس میں انھوں نے تصوف اور ادب کے باہمی تعلق کو بھی واضح کیا ہے اور تصوف کی روایت میں عظیم صوفیا کی تعلیمات اور افکار کا جائزہ لیا ہے جن میں حضرت جنید بغدادی، حسین بن منصور حلاج، ابنِ عربی اور رومی سے لے کر امیر خسرو اور این میری شمل تک لوگ شامل ہیں۔تصوف کی تاریخ اور اس کی تعلیمات خاص طور پر نظریۂ وحدت الوجود سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

ڈاکٹر نفیس اقبال اب ہمارے لیے ایک نئی کتاب لے کر آئی ہیں جس کا عنوان ہے ''تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ'' جو ان کے پندرہ (۱۵) تحقیقی و تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ان کا خیال ہے کہ ''تصوف اخلاقیات کا حامل ہے، اخلاق جمال ہی کا روپ ہے اور جمال تخلیق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔'' لہٰذا تصوف ان مثبت اقدارِ زندگی کی خوبصورتی کا ضامن ہے اور تخلیقی عمل کے لیے جس مکمل ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے وہ ارتکاز صوفی شعرا اور مصنفین کی زندگی کا حصہ ہے۔ لہٰذا تصوف کو ادب خاص کر اردو ادب سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔''اردو کے اولین شعرا اور مصنفین خود صوفی تھے اور تصوف اس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا۔'' یہ نقطہ نظر اردو ادب اور تصوف کو ایک نئے انداز سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر نفیس اقبال کی یہ تحریریں ہماری ادبی تحقیق اور تنقید میں ایک نیا اضافہ ہیں۔انھوں

Marfat.com

نے جس طریق سے تصوف، اس کی تعلیمات، نظریات اور روایت کو اپنے مطالعہ اور تحریر و تصنیف کا موضوع بنایا ہے وہ تمام سکالرز کے لیے ایک مثال ہے خاص طور پر تصوف کا انسان کی داخلی زندگی اور خیر اور جمال سے اس کے تعلق کو انہوں نے نہایت نفیس طریقے سے واضح کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تصوف سے صرف علمی سطح پر ہی واقف نہیں ہیں بلکہ ان کی ذات بھی تصوف کی روایت کا ایک اظہار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اس مطالعے کو جاری رکھیں گی اور آیندہ علم کے اس سمندر کے نئے جزیروں سے اردو قارئین کو متعارف کرائیں گی۔

ڈاکٹر محمد خاں اشرف

جی سی یونیورسٹی، لاہور

28 جولائی، 2011ء

Marfat.com

Marfat.com

تصوُّف اور ادب کا باہمی رشتہ

موجودہ مغربی تصورات سے متاثر ذہن دینی و اخلاقی شعور اور تصوُّف کو ادب کا موضوع نہیں سمجھتے اور ادب کا تعلق جمالیاتی اور اختراعی جبلّت سے جوڑتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اخلاقی دینی نظام پہلے سے ساختہ پرداختہ خدائی ہوتا ہے، اس لیے اس میں اختراع و تخلیق ممکن نہیں۔ جدید ادب نے دین کو پسِ پشت ڈال کر صرف دل کی دنیا کو ادب کی دنیا قرار دیا، حال آں کہ بڑے بڑے شاعروں نے دونوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور ادب کو پوری زندگی کا ترجمان بنایا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون ''جھگڑے دین و دل کے'' میں لکھتے ہیں:

> ''انسانی زندگی عبارت ہے دین اور دل کے مجموعے سے یا ان کی مناسب ترکیب و ارتباط سے..... دین اور دل وہ کہسار ہیں جن کو صرف محبت کے ذریعے سر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ قلزم ہیں جنھیں محبت کی کشتی کے ذریعے ہی عبور کیا جا سکتا ہے اور یہ کشتی ادب ہے جس کا اوّلین موضوع محبت ہے جس سے خدا کی محبت خارج نہیں۔ اسی خدائی محبت کا دوسرا نام دین ہے۔
> ادب کا وسیلہ کیمیائے محبت ہے جو کُل زندگی پر محیط ہے۔''(۱)

ہمارے گرد و پیش کی واقعاتی و وجودی دنیا کی اشیا دراصل ایک باطنی ربط کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور شاعر، اشیا کے باطنی رشتے کو ظاہر کر کے واقعاتی دنیا کے وجود کو نئی وسعتیں عطا کرتا ہے۔ چوں کہ ان نئی وسعتوں کو پرکھنے اور ماپنے کے لیے ہمارے عقلی پیمانے، منطق، علمِ ہندسہ اور طبیعات کے قوانین ہماری کوئی مدد نہیں کرتے، لہٰذا ان کی جانچ اور پرکھ عقل و خرد کے پیمانوں کے بجائے خرد سے ماورا وجدان سے ہوگی۔ ہر تخلیقی عمل، وجدان اور قوتِ

Marfat.com

مخیلہ کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔صوفی بھی شاعر کی طرح اشیا کے باطنی اور روحانی رشتوں کو تلاش کرتا ہے اور اپنے ترکیبی فلسفے کی مدد سے مختلف النوع چیزوں میں باطنی ربط تلاش کرتا ہے اور اشیا کے ظاہری اختلاف کے باوجود ان کی روح میں حقیقتِ اُولیٰ کو منعکس دیکھتا ہے۔(۲)

تصوف کی دو قدریں: عشق اور تَرک؛ تاجرانہ معاشرے میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جاتیں۔ان قدروں کے احساس سے عاری خودغرض اور دنیادار معاشرہ؛ عشق اور ترک کو بے عملی کے مترادف سمجھتا ہے۔تصوف اور شاعری کی باطنی تنظیم کے بغیر عقلی پیمانے پر تسخیرِ فطرت کا نتیجہ فطرت کی ہم سے بغاوت کی شکل میں نکلا ہے۔تصوُّف اور شاعری نے داخلی روّیہ اپنا کر زندگی سے رشتہ جوڑا ہے۔بقول سجاد باقر رضوی:

''صوفی اور شاعر کا زندگی کے ساتھ رشتہ یوں ہے کہ وہ زندگی کی ہماہمی میں شریک بھی ہیں اور اس کے باہر بھی۔''(۳)

شاعر اور صوفی: دونوں کے یہاں اشیا علامتی حقیقتیں بن جاتی ہیں اور یہ اشیا باہمی رشتوں کی وجہ سے ایک باطنی وحدت حاصل کر لیتی ہیں اور ساتھ ہی وہ جیتی جاگتی زندہ حقیقتیں بھی بن جاتی ہیں جن کا انسانی زندگی سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔(۴)

تخلیقی زندگی محض ادب وشعر نہیں بلکہ وہ زندگی ہے جس میں عقل وحسن، انصاف ومحبت کی اقدار ہوں۔زندگی میں خیر ونیکی بہت ضروری ہے کیوں کہ کائنات کا وصف خیر ہے اور خیر کے ادراک کے بغیر زندگی بدشکل اور بنجر بن جاتی ہے۔مثبت اقدار زندگی کی خوبصورتی کی ضامن ہیں اور یہ اقدار تصوُّف میں تعلیم وتربیت کا حصہ ہیں۔صداقت جیسی مثبت قدر متصوفین میں ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ادب بھی مثبت اقدار کی ترجمانی کی بدولت اعلیٰ تصوّر کیا جاتا ہے۔

صداقت کی تلاش ژونگ کو بھی تھی، حال آں کہ وہ مذہبی مفہوم میں صوفی ہرگز نہ تھا بلکہ فرائڈ کے مقلّدین ژونگ کو تحقیر سے صوفی کہتے۔ژونگ نے روحانی قوتوں، انسانی روح کی عظمت، خوابوں میں بشارت، وارداتِ قلبی اور ذات کے باطن سے گہرے رابطے کو نہ صرف مانا ہے بلکہ اپنے نظامِ فکر میں ان سب کو سمونے کی کوشش بھی کی ہے۔ژونگ نے ایک مرتبہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے خود کو سینٹ آگسٹین کے ایک مقولے پر کاربند بتایا:

Marfat.com

''تم باہر نہ جاؤ..... بلکہ اپنے نفس کی گہرائی میں جھانکو۔ اس نہاں خانے
میں صداقت ملے گی۔''(۵)

نفس کی گہرائی میں جھانکنے کی ترغیب تصوُّف سے ملتی ہے۔ نفس کے جہاد کو تصوُّف میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نفس کی گہرائی میں اترنے کے لیے اپنی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور فن بھی اپنی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''فن اپنی طرف لوٹنے کا ایک وظیفہ ہے، اندر کے اَن دیکھے جہان کو
صورت پذیر کرنے کی ایک کاوش ہے۔''(۶)

ادیب جتنا اپنے نفس یا داخل کو صورت پذیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، اُتنا ہی اعلیٰ متصوّر ہوتا ہے۔ صوفی جب اپنے نفس میں جھانک کر حقیقت کی آگہی کو لفظوں کے ذریعے صوفیانہ ادب میں متشکل کرتا ہے تو وہ تخلیق کے عمل سے گزرتا ہے اور خارج کو بھی داخل ہی کا ایک رنگ بنا دیتا ہے۔

وسعتِ قلب ونظر کے بغیر تخلیق کا کام نہیں ہوسکتا۔ یہ وسعتِ قلب ونظر تصوُّف کی بے تعصبی اور رواداری میں نظر آتی ہے۔ تخلیق، جمالیاتی سطح پر قاری کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہنی اُفق کو بھی کشادہ کرتی ہے تاکہ معنی کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر سمجھا جاسکے۔

ساری کائنات کسی بے پایاں اَن دیکھے مرکز کے گرد طواف کر رہی ہے۔ نظامِ شمسی پر نظر ڈالیں تو تمام سیارے سورج کے گرد طواف کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے روشن ہالے کو چھو کر لوٹ بھی جاتے ہیں۔ اگر وہ کبھی اس ہالے کو توڑ کر اندر آجائیں تو سورج کی تمازت میں جل کر راکھ ہو جائیں۔ صوفی اس راکھ ہو جانے کے عمل کا شیدائی ہے، اسی لیے پروانے کی تمثیل اسے بہت عزیز ہے۔ فن کار طواف کا دل دادہ ہے، چھو کر اور خود کو منور کر کے لوٹ جانے کا متمنی ہے تاکہ بار بار آسکے۔ اسے وصال سے زیادہ love play عزیز ہے، جب کہ صوفی قطرے کی صورت دجلے میں جذب ہونے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔(۷) فن کار تخلیقی عمل میں جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، صورتوں اور تمثیلوں میں ڈھالتا ہے۔ جب کہ صوفی سورج کے ہالے میں داخل ہو کر سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے اور حالتِ صحو میں آکر لکھتا ہے، لہٰذا وہ بوقلموں کائنات کو عام ادیب سے زیادہ

Marfat.com

صورتوں، تشبیہوں اور استعاروں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ صوفی ہمہ وقت خود کو خدا کے روبرو پاتا ہے، لہٰذا آفاقی دنیا کا نقشہ بہتر طور پر کھینچتا ہے۔ تخلیق کے اس عمل میں مکمل ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا ارتکاز جو ذہن اور جسم کی رفتار کے فرق کو مٹا کر ذہن کے اضطراب اور خواہشات کے بکھراؤ کو ختم کر دے۔ یہ ارتکاز صوفی شاعر اور مصنف کی زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے، جب کہ ادیب کو اس قسم کے ارتکاز کے لیے کافی کوشش کرنی پڑتی ہے۔

تصوُّف، اخلاقیات کا حامل ہوتا ہے اور اخلاق؛ جمال ہی کا روپ ہوتا ہے۔ جمال، تخلیق کی بنیاد ہوتا ہے۔ مثبت اقدار؛ جمال کی ایک شکل ہیں اور ان کو فروغ دینا جمالیات کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ تصوُّف؛ کائنات میں بکھری جمالی اشکال کو باطنی ربط و تنظیم کے ذریعے ایک مرکزی ہالے میں داخل کر دیتا ہے، جبلّت کو با اخلاق بناتا ہے اور جذبے کی تہذیب کا کام کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''جن معاشروں نے جبلّت کو مارنے کی بجائے اس کی تہذیب کرنے کی کوشش کی، وہاں ایک مضبوط اور دیرپا نظامِ اخلاق نے جنم لیا..... ادیب اگر اخلاقیات کا نمائندہ ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ادب کے لیے پند و نصائح تقسیم کرنے پر مامور ہے بلکہ اس لیے کہ وہ جذبے کی تہذیب کا اہتمام کر کے خلقِ خدا کو جذبے کی بربریت اور تشدد سے نجات دلاتا ہے۔''(۸)

کائنات کی تمام چیزیں حقیقتِ اُولیٰ کی شاہد ہیں، لہٰذا ان کو اصل حقیقت نہ سمجھتے ہوئے حقیقتِ اُولیٰ کی تلاش اور اس میں ضم ہو جانا ہی انسان کی معراج ہے۔ (۹) صوفی حقیقتِ اُولیٰ کو پانے کے بعد باطنی ربط کی وجہ سے نہ صرف انسانوں سے بلکہ کائنات کی دوسری اشیا سے خود کو ہم کنار پاتا ہے، اس لیے اس کا تجزیہ زیادہ وسعت رکھتا ہے اور اس کا بیان جامعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی مثال صوفیانہ مکاتیب اور ملفوظات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

جہاں تک اُردو ادب سے تصوُّف کو علاحدہ کرنے کا سوال ہے تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اُردو کے اوّلین شعرا اور مصنفین خود صوفی تھے۔ جیسے اُردو کے اوّلین شعرا میں شمالی ہند کے مشہور صوفی بزرگ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور گجرات کے شیخ باجن بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ شیخ باجن

Marfat.com

کے علاوہ خوب محمد چشتی، علی محمد جیوگام دھنی اور قاضی محمود دریائی؛ گجری ادب کے ستون ہیں۔ یہ چاروں صوفی شاعر تھے۔ تصوُّف اس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا، گجری ادب اسی استعارے سے پیدا ہوا۔ گجری زبان کو توانائی دے کر ان صوفیہ نے قدیم اُردو کی خدمت کی، اسے ادبی شکل دی۔ جکری کی صنف گجری ادب میں اسی زمانے میں مشہور ہوئی اور قدیم صوفی شعرا نے جکریوں کے ذریعے صوفیانہ ادب تخلیق کیا، اس کے علاوہ خوب محمد چشتی نے اپنی کتاب ''خوب ترنگ'' میں مولانا روم کی طرز پر حکایات کی شکل میں تمثیلیں بیان کی ہیں۔

بہمنی سلطنت دکن میں اُردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھی۔ اس سلطنت کی تشکیل میں صوفیانہ روایات کا مؤثر کردار ہے۔ اس دور میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے ''چکی نامہ'' کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس نے انسانی وجود کو چکی کا استعارہ بنا کر بامعنی بنا دیا۔ روحانی دانش کو فروغ دینے والے شاہ شمس العشاقؒ کے دوہے ادب سے کیسے خارج ہو سکتے ہیں، بیجاپور کا ادب شاہ برہان الدین جانمؒ، شیخ غلام داول اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے بغیر نامکمل ہے، اور یہ سب صوفیہ تھے۔

اُردو کی طرح فارسی ادب، مولاناؒ روم، حافظؔ شیرازی، عراقیؔ اور سعدیؔ کے بغیر کہاں ادب رہتا ہے۔ فارسی غزل اگر حافظؔ اور عراقیؔ کے بغیر نامکمل ہے تو اُردو غزل سے میرؔ اور دردؔ کو نکال کر کیا بچتا ہے۔ اُردو ادب کے یہ دونوں بڑے شاعر صوفی تھے۔ دردؔ کے صوفی ہونے میں تو کسی کو شک نہیں مگر میرؔ کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ انسانی زندگی میں بچپن کے ماحول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرؔ کا بچپن اُن کے والد علی متقی اور چچا سید امان اللہ کے سائے میں گزرا جو صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ میرؔ بھی فقیر منش بزرگ تھے۔ ان کے یہاں زندگی کے اعلیٰ معیار اور بے نیازی کی روش تصوُّف ہی کی دین ہے۔

شعورِ ذات حاصل ہونا اور اپنی جہت کے تعین پر قادر ہونا صوفی شاعر اور مصنف کو ایک خاص حرکی قوت اور خاص رفتار کا مالک بنا دیتا ہے۔ اس کی مدد سے تخلیق نگار جو کچھ تحریر کرتا ہے، اسے ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ صوفی کے اندرون روشنی اُس کی تحریروں میں منعکس ہوتی ہے اور اُن تحریروں کو پڑھ کر قلب و ذہن کی تاریکی سے چھٹکارا ملتا ہے۔

تصوُّف ایک مضبوط تہذیبی ورثہ ہے جس کی عکاسی تحریر میں کلاسیکی رنگ بھر دیتی ہے

Marfat.com

اورادب کو جمالیاتی سطح پر بلند کرنے کے ساتھ ساتھ آفاقی حیثیت بھی عطا کرتی ہے، کیوں کہ کلاسیکی ادب میں ابدیت اور ہمیشگی کا رنگ پایا جاتا ہے اور اس میں علاقے کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ابنِ عربی کی فصوص الحکم اور مولانا رومؒ کی مثنوی کو عالم گیر شہرت حاصل ہے۔

اُردو کی اصنافِ سخن خصوصاً غزل میں تصوُّف کے مسائل اس کثرت سے ادا کیے گئے ہیں کہ اگر صوفیانہ اشعار کو خارج کر دیا جائے تو اُردو کا نصف سے زیادہ سرمایۂ شعری باقی نہ رہے۔ تصوُّف نے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات؛ شاعری میں داخل کر کے شاعری کو وسعت بخشی؛ تصوُّف کی آمیزش نے عاشقانہ شاعری کے مزاج کی اصلاح کر کے تصورِ محبت کو بلند کیا، اظہارِ محبت میں ادب و شائستگی اور وقار و متانت کے پہلو نکالے، صوفی شعرا نے قصیدہ گوئی کو خوشامد سے پاک کیا؛ تصوُّف کی بدولت فلسفہ بھی شاعری میں داخل ہوا؛ تصوُّف نے شاعری مین انسان کی عزتِ نفس کا خیال پیدا کیا اور انسان کو بتایا کہ وہ کون و مکان کو تسخیر کر سکتا ہے؛ اُردو شاعری کی جسارت اور بے باکی صوفیہ کی شطحیات کی بدولت ہے اور یہ باغیانہ بے ادبی نہیں بلکہ نازِ عبودیت ہے۔شبلی کے بقول: ''وحدت الوجود کا مسئلہ سرتاپا شاعری ہے۔''(۱۰)

تصوُّف کی تعلیمات میں راز داری کی لہر سے اُردو شاعری نے ''اخفائے راز'' کا گُر اور رمزیت سیکھی۔صفی حیدر دانش لکھتے ہیں:

> ''تصوُّف وجدِ شاعرانہ کی ایک آئینی شکل ہے اور شاعری ذوقِ صوفیانہ کی ایک والہانہ صورت کہی جا سکتی ہے۔ ہر صوفی، ذوقِ شعر سے اور ہر شاعر، تصوُّف سے فطری لگاؤ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوُّف و شاعری میں ان کے باہمی اشتراکیتِ وجدانیت کے سبب سے ایک ایسا بنیادی رابطۂ اتحاد قائم ہے جو کسی حالت میں منقطع نہیں کیا جا سکتا۔''(۱۱)

اُردو شاعری پر تصوُّف کے ان احسانات کے پیشِ نظر ہم بآسانی کہ سکتے ہیں کہ اُردو ادب سے تصوُّف کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔اُردو شاعری روزِ اوّل سے ہی آغوشِ تصوُّف میں پرورش پاتی رہی۔تصوُّف کی چاٹ اسے ورثے میں ملی۔فارسی شاعری کی واردات و حقائق اور اصطلاحات اُردو شاعری میں رچ بس گئیں۔بعض موقعوں پر قصائد کی تشبیبوں تک میں معرفت کے مضامین

Marfat.com

نفاست سے باندھے گئے۔ مختصر یہ کہ شاعری اپنے آہنگ واطوار میں تصوُّف سے پورے طور پر متاثر رہی ہے۔ اُردو شاعری میں قلب کی اہمیت مسلّم ہے اور یہی دل، تصوُّف میں ادراک کا محل ہے: انسان پر جس قدر مکاشفات ہوتے ہیں اور وارداتیں گزرتی ہیں، اسی دل سے تعلق رکھتی ہیں۔

صوفیہ کرام ہمیشہ شعر کہنے اور سننے کے شوقین رہے ہیں۔ صفی حیدر دانش نے دوسری صدی ہجری میں رابعہ شامیہ اور تیسری چوتھی صدی ہجری میں سری سقطی (متوفی ۲۵۳ھ/ ۶۸۔۸۶۷ء) اور سمنون بن حمزہ سمیت متعدد صوفیہ سے منسوب صوفیانہ اشعار کا ذکر کیا ہے۔ (۱۲)

استعارات وتمثیلات شاعری کا زیور ہیں۔ صوفیانہ واردات کے بیان میں بھی اہلِ تصوُّف کا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا کیوں کہ ان کے باطنی جذبات وتجربات کی ترجمانی ایسے ہی اسالیب سے ہوسکتی ہے جو قارئین وسامعین کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرسکیں اور شاعرانہ طرزِ بیان کا مقصد بھی قارئین کے ذہن میں ایک ایسا مفہوم لانا ہے جو عام سطح سے بلند تر ہو۔ صوفیانہ ادب میں رمزیت پسندی کی وجہ یہی ہے۔ بقول صفی حیدر دانش:

> ''کبیر کے الفاظ میں صوفیانہ لذت گونگے کی زبان کا ذائقہ ہے جس کو بیان کرنے کے بجائے وہ صرف اشاروں سے ظاہر کرسکتا ہے۔ گونگے آدمی کی طرح صوفی بھی اشارے کردیتا ہے، یہی اشارے شاعری ہیں جو تصوُّف کی زبان ہے۔ ہمارے ادب میں جو ساحل ومنزل، غبار و کارواں، مے خانہ وجام وسبو کی اصطلاحات ملتی ہیں، وہ تصوُّف ہی کی رہینِ منّت ہیں۔ نغمہ سرایانِ بزمِ تصوُّف معترف ہیں کہ ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی بادہ وساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی۔'' (۱۳)

اہلِ تصوُّف کی شعر وشاعری سے دلچسپی کے سلسلے میں حضرت نظام الدینؒ اولیا اور حضرت امیر خسروؒ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے سامنے حضرت امیر خسروؒ اشعار پڑھتے اور حضرت نظام الدینؒ اولیا محظوظ ہوتے، بلکہ ان کی پہلی ملاقات بھی شعر وشاعری کے ذریعے مکالمہ بازی کے بعد ہوئی۔ امیر خسروؒ نے اپنے دور کے وجدانی تناظر کو محفوظ کر کے شاعری اور صوفیانہ مسلک کو غیر منقسم بنا دیا۔ ہمارے ادبی اور فکری رویّوں کی تاریخ حضرت

Marfat.com

امیر خسروؒ سے شروع ہوتی ہے۔ان کے صوفیانہ مسلک نے اس تاریخ کو موضوعات، طریقِ کار، تناظر اور سمت نمائی مہیا کی۔ مجنوں، جذب وشوق کی علامت بن کر ادبی اور فکری تاریخ میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔اس کا عکس رانجھن اور پنّوں کی صورتوں میں علاقائی شاعری میں ظاہر ہوتا ہے اور لوک گیتوں کے ذریعے طول وعرض میں اس صوفیانہ مسلک کی گونج برابر سنائی دیتی ہے۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> ''امیر خسروؒ کے صوفیانہ مسلک میں فکر، تخلیقی صورت اختیار کرتا ہے اور شاعری، تصوُّف کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ایسا ادبی رویّہ بلاشبہ بلادِ اسلامیہ کی روایت سے مستعار تھا، تاہم برصغیر میں اس رویّے کی اوّلین مثال امیر خسروؒ کی تھی۔ اس ادبی رویّے نے صوفیانہ مسلک کے تجربے اور واردات کو شعری تجربے اور واردات کی صورت دی اور اس طرح انسان کے محسوسات کو گہرا کر کے اُنھیں حقائق کو قبول کرنے کی توانائی عطا کی۔''(۱۴)

زندگی کی تین مختلف صورتیں یا مراحل ہیں: جمالیاتی مرحلہ، اخلاقی مرحلہ اور مذہبی مرحلہ۔ان تینوں مراحل کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی اور یہ تینوں مرحلے تصوُّف میں پورے ہو جاتے ہیں۔ابدیت سے ہم کنار ہونے کے لیے مکمل زندگی سے ہم کنار ہونا ضروری ہے، اس مکمل زندگی کا ترجمان ادب ہی آفاقی یا کلاسیکل ادب ہوگا۔ یہ ادب اُس انسان کی زندگی کو منعکس کرے گا جو ساری کائنات اپنے اندر سموئے پھرتا ہے اور اپنے اندرون میں داخل ہو کر رازِ عالم کے قریب ترین پہنچ جاتا ہے۔ایسے ادب کو تخلیق کرنے والے کے دماغ میں روحِ عالم سمٹ آتی ہے اور وہ اپنی قوتِ متخیلہ سے تخلیق کے عمل کو مکمل کرتا ہے کیوں کہ تخلیقی عمل: عقل اور تخیل کے مابین نازک تعامل (interaction) سے وجود میں آتا ہے۔ وجودی صورتِ حال کو فن کارانہ پیرایے میں ڈھالنے کی خلقی ضرورت کو صوفی کا تخیل پورا کرتا ہے، کیوں کہ آرٹ کی سمجھ صرف اُس شخص کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو جانتا ہے اور اپنے نفس کی گہرائیوں سے واقف ہے اور صوفی کے سوا کون اپنے نفس کے نہاں خانوں سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: ادب وفن۔ لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی۔ طبعِ اوّل، جون ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۶۵ تا ۱۶۸۔

۲۔ سجاد باقر رضوی: تہذیب وتخلیق۔ (مضمون ''تصوُّف وادب کا باہمی رشتہ'')، لاہور، مکتبۂ ادب جدید۔ پہلی اشاعت، اپریل ۱۹۶۶ء۔ ص ۱۳، ۱۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۵۔ بہ حوالہ ڈاکٹر سلیم اختر: مغرب میں نفسیاتی تنقید۔ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔ ۱۹۹۸ء۔ ص ۹۸۔

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا: معنی اور تناظر۔ سرگودھا، مکتبۂ نردبان۔ دسمبر ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۵۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا: مضمون ''ادب اور اخلاقیات''، مشمولہ: ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین، مرتب: سید سجاد نقوی۔ لاہور، مکتبہ عالیہ۔ ۱۹۹۵ء۔ ص ۲۲۷، ۲۳۲۔

۹۔ تہذیب وتخلیق: ص ۱۴، ۱۵۔

۱۰۔ بحوالہ: پروفیسر سید صفی حیدر دانش، سرورق اور دیباچہ تصوُّف اور اُردو شاعری۔ لاہور، سندھ ساگر اکادمی۔ ۱۹۴۸ء۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۱۴۔ جیلانی کامران: امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک۔ لاہور، جنگ پبلشرز۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۸۸، ۸۹۔

Marfat.com

Marfat.com

سلسلۂ قادریہ اور تعلیماتِ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تیرھویں صدی عیسوی میں تحریکِ تصوُّف عروج پر تھی۔ اسی صدی میں روحانی سلاسل وجود میں آئے اور اُن کی تشکیل نے تحریکِ تصوُّف میں جان ڈال کر معراجِ کمال پر پہنچا دیا اور اسی صدی میں اسلامی تصوُّف کی تاریخ مکمل ہوگئی کیوں کہ یہ سلسلے تصوُّف کے ارتقا کی آخری منزل ہیں۔ اگر اُن حالات کا جائزہ لیں جن میں سلاسل وجود میں آئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عجمی مسلمانوں کی زوال پذیر سیاسی اور سماجی زندگی تیرھویں صدی میں تباہی کی آخری منزل پر تھی۔ سیاسی نظام بے جان اور سماج انتشار کا شکار تھا۔ ہر طرف غارت گری کا دور دورہ تھا۔ صنعت و حرفت تباہ ہو چکی تھی۔ بغداد کے وہ علاقے جہاں تاجروں کا ہجوم تھا، کبوتر بازوں کا اڈا بن چکے تھے۔ سیاسی، سماجی اور صنعتی زوال کے ساتھ اخلاقی زوال ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔ منگولوں کے حملے مسلمانوں کے اسی زوال کا نتیجہ تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''منگولوں کے حملے مسلمانوں کے زوال کا نتیجہ تھے، سبب نہ تھے..... خانقاہیں اور مدرسے بے نور و چراغ ہو گئے۔ کتب خانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔''(۱)

اِن حالات میں صوفیہ نے مسلمانوں کے ذہنی انتشار کے خاتمے کے لیے سلاسل کی تنظیم شروع کر دی۔ سلسلوں کے عروج سے مسلمانوں کے ذہن ایک مرکز پہ آ گئے۔ صوفیہ کی بالغ نظری نے اسلامی دنیا میں خانقاہوں کو آباد کر دیا اور عوام کی اصلاح اور تربیت کا انتظام کیا۔ یہ زوال میں تجدید و احیاء کی صورتیں تھیں۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

> ''جب تباہی حد سے گزر جاتی ہے تو ترقی کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔

Marfat.com

شکست میں فتح کے اسباب مہیا کیے جاتے ہیں اور دشمن سے ہمدردی کرا دی جاتی ہے۔ منگولوں نے جس بیدردی اور سفا کی کے ساتھ اسلام کے سیاسی اور سماجی نظام کو درہم برہم کیا، اس سے کون واقف نہیں۔ پھر انہی دشمنانِ اسلام کو حلقہ بگوشِ اسلام بنا کر ان ہی سے مسلمانوں کی اجڑی ہوئی بستیوں کو از سرِ نو آباد کرنے کا کام لیا گیا۔''(۲)

اس زمانے میں شاعروں نے اشعار کے ذریعے صوفیانہ خیالات کی ترویج و اشاعت کی تو اکابر مشائخ نے روحانی سلاسل کی ترتیب و تنظیم سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ صوفیہ نے تصوُّف کے اخلاقی پہلو کو اجاگر کر کے عوام کی ذہنی ابتری کو ختم کیا اور چپا چپا پر اپنا روحانی نظام قائم کر دیا۔ سلسلوں کی تنظیم کے ذریعے ہی تحریکِ تصوُّف کو عوامی سطح پر منظم کیا جا سکتا تھا۔ تحریکِ تصوُّف کے مختلف علاقوں اور زمانوں میں آگے بڑھنے کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ایک بار ضیاالدین برنی سے فرمایا تھا:

''خدا تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ کی ایک خاصیت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے آدمیوں کا طریقہ اور رواج و رسم علیحدہ اور جدا ہوتا ہے اور زمانہ کی رفتار لوگوں میں اس درجہ اثر کرتی ہے کہ زمانۂ موجودہ کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت گذشتہ لوگوں کے اخلاق و طبائع کے ساتھ بالکل مشابہت نہیں رکھتے۔ البتہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعتیں پہلے لوگوں کی طبیعتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اور یہ بات تجربات سے خوب واضح ہوتی ہے۔''(۳)

حالات اور وقت کے اسی تقاضے نے سلسلوں کی تنظیم کا راستہ ہموار کیا اور تدوینِ فکر سے ہٹ کر صوفیہ نے تصوُّف کی تحریک کو عوامی تحریک میں تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ صوفیہ کی تنظیمی جدوجہد نے رفتہ رفتہ منظم اور باقاعدہ سلسلوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ کوشش دراصل صحت مند معاشرے کا تصور مہیا کر رہی تھی۔ جو سلسلہ جس جگہ قائم ہوا، اس سلسلے کے صوفیہ نے اُس جگہ کی مناسبت سے ذہنی فضا، جغرافیائی حالات اور فکری پس منظر کو نظر میں رکھا۔ اس طرح سلسلوں

Marfat.com

کا نظام اُس علاقہ کے ذہنی اور فکری ماحول سے ہم آہنگ ہو گیا۔ روحانی تربیت کے تجویز کردہ اشغال میں اُس علاقے کے لوگوں کے مزاج کا خاص لحاظ رکھا گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگر چہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے سلسلوں کے قیام کے لیے سب سے پہلے فضا ہموار کی تھی اور نہایت وسیع پیمانے پر عوام سے رابطہ قائم کیا تھا لیکن ان کے سلسلہ کو باقاعدہ ایک سلسلہ کی حیثیت حاصل کرنے میں کافی مدت لگی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا حلقۂ اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور اُن کے معتقدین عرب و عجم کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن سلسلہ کی تنظیمی شکل اُن کے وصال سے کم و بیش پچاس سال بعد ظاہر ہوئی۔ قادریہ سلسلہ کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کہا ہے:

> ''سب طریقوں سے قادریہ طریقہ عرب اور ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔''(۴)

صوفیائے متقدمین کی خدمت کا دائرہ فکری اور نظری تھا۔ اب میدانِ عمل میں داخل ہونے کی ضرورت تھی۔ سلسلۂ قادریہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی ایک مجلس میں اعلان کیا تھا:

> ''صاحبو! اتباع کرو، یہاں تک کہ متبوع بن جاؤ۔ خدمت کرو، یہاں تک کہ مخدوم بنو۔ اتباع کرو، قضاوقدر کی اور ان کے خادم بنے رہو یہاں تک کہ وہ تمھاری تابعدار اور خدمت گزار بن جاویں۔ تم جھکو اُن کے سامنے وہ جھک جائیں گی تمھارے سامنے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ ''جیسا تو معاملہ کرے گا ویسا تیرے ساتھ معاملہ کیا جائے گا'' جیسے تم ہو گے ویسے (حاکم) تم پر مسلط ہوں گے (گویا) تمھارے اعمال ہی (مجسم ہو کر) تمھارے افسر بنیں گے۔''(۵)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے تصوُّف کو خالص اسلامی رنگ میں پیش کیا اور اس کے بنیادی افکار و نظریات کو عوام تک پہنچایا اور اپنے پرتاثیر مواعظ سے ایک دینی انقلاب برپا کر دیا۔ عوام کی غفلت شعاری سے رنجیدہ ہو کر فرمایا:

Marfat.com

''تمھارے دل کس قدر سخت ہو گئے؟ تم پتھر کے بن گئے۔ میں تم سے کہ رہا ہوں اور دوسرے بھی کہ رہے ہیں مگر تم ایک ہی حالت پر قائم ہو۔''(۶)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی پرزور آواز نے سوتی ہوئی بستیاں جگا دیں اور تلاشِ حق اور اتباعِ سنت کی لہر ہر طرف دوڑا دی۔ شریعت اور طریقت کے بارے میں حضور غوث الاعظمؒ فرماتے ہیں:

شریعت اور طریقت جب دونوں ملتے ہیں تو فقیر مکمل ہو جاتا ہے کیوں کہ کائنات میں سب سے زیادہ حقیقت اور معرفت کا علم رکھنے والے فخرِ دو عالم نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور انہوں نے شریعت نافذ فرمائی۔ دراصل شریعت نکلی ہی حقیقت سے ہے بلکہ معرفت کا عکس ہے۔''(۷)

گیارھویں صدی عیسوی میں جہاں ایک طرف شیخ ابوالقاسم قشیریؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ اور ابوسعید ابوالخیرؒ اور دوسرے اکابر صوفیہ اسلامی فنِ تصوّف اور تعلیماتِ تصوّف کو مستقل موضوع بنا کر کتابیں لکھ رہے تھے، وہاں اسماعیلیہ فرقہ کے پرجوش اور انقلابی قسم کے داعی حسن بن صباح نے بھی ایران اور مصر تک عروج حاصل کر رکھا تھا۔ دیگر نام نہاد مذہبی فرقہ وارانہ تحریکیں بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اپنی تصنیف ''غنیۃ الطالبین'' میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کئی مذہبی فرقوں کو گمراہ فرقے قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام میں پیدا ہونے والے فرقوں اور گروہوں کا تفصیل سے ذکر کر کے اہل سنت و جماعت فرقہ کو ان فرقوں میں نجات پانے والا کہا ہے۔ فقہ میں وہ امام احمد بن حنبلؒ (۷۸۰-۸۵۵ء) کے مقلد تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے منصور حلاج اور معتزلہ کے درمیانی عہد میں زندگی بسر کی۔ معتزلہ عقائد و تعلیمات کو عقل کی روشنی میں پرکھنے پر زور دیتے تھے۔ معتزلہ عقائد کے خلاف امام احمد بن حنبلؒ ایک بہت بڑی ڈھال بنے رہے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی اپنی تعلیمات میں امام احمد بن حنبلؒ کے پیروکار اور انہی کے مشن کو آگے بڑھانے والے تھے۔ اس

۱۲۴۹۸۴
Marfat.com

دورِ پُر آشوب میں قرامطیوں نے بھی اسلامی مرکز میں ایک باطنی تحریک کے تحت تباہی پھیلا رکھی تھی اور مقاماتِ مقدسہ کو بھی نقصان پہنچایا جانے لگا تھا۔ یہ تمام شورشیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سامنے تھیں۔ انھوں نے دینی اور قرآنی بصیرت کی روشنی میں عقلیت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور شریعت اور طریقت کے مابین ایک خاص توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عقل کو ناکافی اور خودغرض قرار دیتے ہوئے عقل کو وحی کے تابع رکھنے کی تعلیم دی۔ اس اعتبار سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اجتہادی کام کیا اور یوں انھوں نے دینِ حق کو ایک تحفظ اور قوت بخشی اور باطل افکار و خیالات کی بیخ کنی کی اسی لیے انھیں محی الدین کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ (۸)

بغداد کے جس دارالعلوم میں غوث الاعظمؒ شریکِ تعلیم رہے وہاں کے شیخ الجامعہ نے تکمیلِ تعلیم پر ایک پُر وقار تقریب میں علومِ شرعیہ کی سند اُنھیں عطا کرتے وقت فخر محسوس کیا اور غوث الاعظمؒ کی دانش و فراست کو قابلِ رشک قرار دیا اور اُن کی متعدد مقامات پر احادیث کی تاویل سے استفادہ کرنے کا اقرار کیا۔ اس تعلیمی افتخار کے ساتھ انھیں بارگاہِ ربوبیت میں بھی بلند مقام تھا جس کا اظہار یہ فرما کر کیا کہ میں حق تعالیٰ کے اُلٹنے پلٹنے والے ہاتھ میں ہوں۔ کبھی وہ مجھے پہاڑ بنا دیتا ہے اور کبھی ذرّہ، کبھی وہ مجھے سمندر کر دیتا ہے اور کبھی قطرہ، کبھی وہ مجھے آفتاب بنا دیتا ہے اور کبھی چمک، مجھے اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے، جیسے رات اور دن کو پلٹتا رہتا ہے، ہر دن وہ اپنی ہی ایک شان میں ہوتا ہے بلکہ ہر لحظہ۔ اُن کے مقامِ قرب کو پہچاننے والے کے بارے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے مریدوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''جو مجھے پہچان لے گا، وہ مرتے دم تک میرے پاس سے نہ ٹلے گا۔
میرے سبب دوسروں سے مستغنی ہو جائے گا۔''(۹)

مؤرخین کے بیان کے مطابق بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا۔ آپ کی تبلیغ کی وجہ سے لاکھوں غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ کی تصنیفات نے اسلام کی تبلیغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انھوں نے لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لگایا اور توحید و معرفت کو باطن کو مہذب بنانے کا ذریعہ بتایا۔ آپ کی مجالسِ وعظ میں بادشاہ، وزرا اور امرا نیازمندانہ حاضر ہوتے تھے۔ آپ اپنے وعظ میں کسی

Marfat.com

کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ حق بات کو برملا کہہ دیتے اور اپنی سخت کلامی کو لوگوں کے لیے آبِ حیات ثابت کرتے۔ سچ کی تعلیم دیتے ہوئے قزاقوں کے سردار کے کہنے پر آپ نے عبا سے پورے چالیس دینار نکال دیے جو آپ کی والدہ نے بطورِ حفاظت سی دیے تھے۔ چالیس دینار برآمد ہونے پر سردار متحیر ہوا اور آپ سے رقم بچانے کے لیے تدبیر نہ کرنے کی وجہ پوچھی۔ تو آپ نے والدہ کی تعلیم ''سچ زندگی ہے اور جھوٹ موت'' بتادی۔ صداقت سردار کے دل پر بجلی بن کر گری اور سردار کے قلب کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنے رب سے کیا ہوا عہد یاد آ گیا۔ یہ تھی سچ کی تعلیم اور اس کا اثر۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے وعظوں میں تاثیر کی وجہ اُن کا اخلاق تھا۔ وہ نرم دل اور عہد و پیمان کے پکے تھے۔ جاہ وجلال کے باوجود ہر چھوٹے بڑے کی عزت کرتے تھے۔ کمزوروں کے ساتھ بیٹھتے، فقیروں کی تواضع کرتے لیکن کبھی کسی امیر کے لیے کھڑے نہ ہوتے اور نہ کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازے پر جاتے۔ یہی تعلیم اپنے بیٹے شیخ سیف الدین عبدالوہابؒ کو وصیت کرتے وقت دی کہ خدا کے سوا کسی سے خوف یا امید نہ رکھو۔ تمام حاجتیں خدا ہی کو سونپ دو اور اسی سے طلب کرتے رہو۔ بجز خدا کے کسی پر اعتماد نہ رکھو۔ اپنے اوپر توحید کو لازم رکھو۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے وعظ بڑے پُرتاثیر ہوتے تھے۔ ہر طرح کے لوگ اس میں شرکت کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے:

> ''حضرت کی مجلس، کبھی یہود و نصاریٰ سے جو مشرف بہ اسلام ہوتے تھے اور قزاق، بدعتی اور فسادیوں سے جو دستِ حق پرست پر توبہ کرتے تھے، خالی نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات حاضرین کی تعداد ستر ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ حضرت کی مجلسِ وعظ میں چار سو آدمی قلم دوات لیے بیٹھے رہتے تھے اور جو اُن سے سنتے تھے وہ لکھ لیتے تھے۔''(۱۰)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظِ حسنہ کے دو مجموعے ''فتوح الغیب'' اور ''فتح الربانی'' ہیں۔ فتوح الغیب میں اٹھتر وعظ نقل کیے گئے ہیں۔ فتح الربانی میں وہ باسٹھ خطبات شامل ہیں جو انھوں نے ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء اور ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں دیے تھے۔ یہ وعظ اور خطبات دل کی آواز ہیں

Marfat.com

اوران کی تعلیمات دل پر اثر کرتی ہیں۔''فتوح الغیب'' تصوُّف کی تعلیم کے متعلق ایک جامع کتاب ہے۔اس کتاب میں پہلے مقالے میں مومن کے لیے تین چیزوں کوضروری قرار دیا۔

''اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر بجالائے۔ دوم یہ کہ اُس کے نواہی یعنی روکے ہوئے کاموں سے پرہیز کرے۔سوم یہ کہ قضا وقدر پر راضی ہو جائے۔''(۱۱)

شریعت کی پابندی کی تعلیم دیتے ہوئے ''فتوح الغیب'' میں آپ نے تحریر فرمایا:

''سنت کی پیروی کرو اور بدعت نہ کرو یعنی خلافِ سنت کوئی کام نہ کرو۔ اطاعت کرو۔شرک نہ کرو۔اللہ تعالیٰ کومنزہ جانو اوراُس پر بہتان نہ لگاؤ۔ توحید کی تصدیق کرواوراس میں کسی قسم کا شک نہ لاؤ۔''(۱۲)

سیدنا عبدالقادر جیلانی ؒ نے اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنے کی تعلیم دی ہے۔ ترکِ طلب کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اے سالک!اس بات کو جان لے کہ ترکِ طلب سے تیرا مقسوم تجھ سے فوت نہ ہوگا اور جو چیز تیری قسمت کی نہیں ہے اُسے تو اپنی طلب وتلاش اور کوشش میں حریص ہونے سے بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ پس صبر کر اور جس پر خداوند تعالیٰ تجھے رکھے اُس پر راضی رہ۔''(۱۳)

غوث الاعظمؒ نے بے عمل عامل سے بچنے کی تلقین کی ہے اور حسد کو ایمان ضعیف کرنے والی چیز بتایا۔قربِ الٰہی کی ابتدا ورع اور انتہا رضا وتسلیم اور توکل کو بتایا۔فنا اور اُس کے مراتب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''بندہ جب خلق وہوا ونفس وارادہ اور دنیا وآخرت کی تمام اُمیدوں سے فانی ہوجاتا ہے اور اللہ عزّ وجل کے سوا کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا اور ہر شے کی محبت اُس کے دل سے نکل جاتی ہے تو وہ واصل باللہ ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے چُن لیتا ہے اور برگزیدہ بنالیتا ہے اور اُسے اپنا محبوب بنالیتا ہے اور اُسے اپنی خلقت کا بھی محبوب بنادیتا ہے اور اُسے ایسا بنادیتا ہے کہ

Marfat.com

اُس کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ عشق بازی کرتا ہے اور اُس بندہ کے قرب کو بھی پسند کرتا ہے۔"(۱۴)

آپ نے توحیدِ خالص کی تعلیم دیتے ہوئے ماسوا سے قطع تعلق کرنے کی تعلیم اس طرح دی ہے:

"اے سالک! تمام جہات سے اندھا بن جا۔ غیر اللہ پر نگاہ نہ رکھ۔ تیرا بھروسا محض اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شے پر بھروسا نہ کرو اور نہ ہی اپنی قوت وکسب و مال و جاہ پر بھروسا کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی نقصان پہنچا سکتی ہے۔"(۱۵)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے تصوُّف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر رکھی ہے:

(۱) سخاوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح (۲) رضا حضرت اسحاق علیہ السلام کی سی (۳) صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح (۴) اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام کے مانند، یعنی اُن کی طرح عاجز ہو کر خاموشی سے دعا کرنا اور اُس کا قبول ہونا۔ (۵) حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرح غربت اختیار کرنی یعنی وطن سے دور رہ کر درگاہِ رب العزت میں گریہ و زاری کرنا (۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح صوف پہننا (۷) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح سیاحت اختیار کرنا یعنی اپنا کوئی گھر نہ بنانا (۸) اور ختم المرسلین جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح فقر اختیار کرنا۔(۱۶)

جناب غوث الاعظمؒ نے امیروں کے ساتھ وقار و خودداری کے ساتھ اور غریبوں کے ساتھ تواضع و عاجزی کے ساتھ ملنے کا درس دیا۔ خلق سے گونگا بہرہ بننے اور اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے کی تعلیم دی۔ اللہ کی جھوٹی قسم نہ کھانے کی تلقین کی۔ جھوٹ سے پرہیز، وعدہ خلافی سے بچنے، کسی پر اپنا بوجھ ڈالنے سے اجتناب کی تعلیم دی۔

حضرت غوث الاعظمؒ نے شاعری کو بھی ذریعۂ ابلاغ بنایا۔ قصائد، قصیدہ غوثیہ اور ایک دیوان آپ سے منسوب ہے۔ دیوان غوث الاعظم (محی الدین) فارسی کلام کا دیوان ردیف وار

Marfat.com

۳۸ غزلیات پر مشتمل ہے۔اس دیوان کے چند ایک اُردو تراجم ہو چکے ہیں۔ یہ دیوان بھی آپ کے مواعظِ حسنہ ہی کا منظوم مجموعہ ہے۔ان شاعرانہ افکار و خیالات کو وجدانی کیفیات اور الہامی باتیں کہا جا سکتا ہے۔اس دیوان کے شاعرانہ افکار دراصل متعدد قرآنی آیات کی شرح ہیں۔ دیوان میں شامل غزلیات اُن کی متصوفانہ کتب کے بعض مضامین کی وضاحت کرتی ہیں۔اس طرح سے حضرت محی الدین غوث الاعظمؒ کی شاعری سراسر تصوُّف اور تفسیر و حدیث کی شرح ہے اور دیگر تصانیف کی طرح تبلیغی اور توضیحی خدمات بھی انجام دیتی ہے۔آپ کی شاعری میں بندے اور اللہ کے رشتے کو عشقِ الٰہی کے حوالے سے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔رجائی رنگ بھی شاعری کے افکارِ عالیہ میں بڑا واضح ہے۔

محمد علی چراغ ''دیوانِ غوثِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ'' کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''اس شاعری کی حیثیت اور مقام تشریحِ دین اور توضیحِ ارکانِ دین ہے.....خالص دینی افکار کو اپنی شاعری میں سمو کر غزل کو مضامینِ نو سے معمور اور مرصع کیا ہے۔یوں انھوں نے صدیوں پیشتر غزلیہ شاعری کو حمد و نعت کی سی تقدیس و تکریم سے ہمکنار کرایا ہے۔انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں اعلیٰ تصوفانہ افکار و واردات کو سمونے کے لیے خوش آئند قرینوں کو اپنایا ہے۔''(۱۷)

شاعرانہ انداز میں جناب غوث الاعظمؒ کی تعلیمات کا رنگ کچھ اس طرح ہے۔ کچھ فارسی اشعار ترجمے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں:

وقتِ تجلیِ خدا در رقص آمدہ کوہِ طور
اندر دلِ سنگینِ سنگ از بسکہ پیدا شد طرب

ترجمہ: تجلیِ خدا کے وقت کوہِ طور پر رقص کی کیفیت طاری ہوگئی اور یوں سخت دل پتھر کے اندر بھی طرب اور مستی پیدا ہوگئی۔یہ اثر تھا جلوۂ حق کی کیفیت کا۔

چوں ترا سلطان گرفت اندر پناہ
غم مخور از ہیچ ملک و انقلاب

Marfat.com

ترجمہ: جب سلطان نے تمھیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے تو پھر تمھیں کسی ملک وانقلاب کا کوئی غم نہیں ہونا چاہیے۔

عشقِ تو باگل ست روزے چند
عشقِ ما عشقِ جاوداں آمد

ترجمہ: تیرا عشق تو صرف پھول کے ساتھ چند روزہ ہے جب کہ میرا عشق تو عشقِ جاوداں ہے۔

سایۂ طوبیٰ و جنت، حوضِ کوثر را کجا است
آں حلاوت ہا کہ باشد در وصالِ کردگار

ترجمہ: طوبیٰ کے سایوں میں، جنت اور حوضِ کوثر میں وہ شیرینی اور مٹھاس ہرگز نہیں ہے جو اس پروردگار کے دیدار اور لقا میں موجود ہے۔

چشمِ تر یک نیم شب گو اے خدا در من نگر
پس شبا روزے نظر را شصت و سہ صد برشما

ترجمہ: تم آدھی رات کے وقت صرف ایک بار اپنی چشمِ تر سے درخواست کرو کہ مجھ پر نظر ہو پھر تم فریاد نیم شبی کے کرشمے تو دیکھو۔ تم دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ رات دن میں تین سو ساٹھ بار تمھیں محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

در ہمہ مذہب و ملّت مے عشقت حلال
زانکہ بے او نتواں دید خدارا دیدار

ترجمہ: ہر مذہب وملّت میں تیرے عشق کی مَے حلال ہے کیوں کہ اس کے بغیر دیدارِ خدا حاصل ہی نہیں ہوتا۔

نومید مشو بندہ از رحمتِ ما ہرگز
زیرا کہ بغیر از ما کس نیست ترا ہرگز

ترجمہ: اے بندے! تو ہماری رحمت سے ہرگز ناامید نہ ہو۔ ہمارے در پر ناامیدی گناہ ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے سوا تمھارا اور کوئی نہیں ہے۔

Marfat.com

گر جمال حق تعالیٰ آرزو دارد کسے
گو برو آئینہ دل رابزن صیقل زنگ

ترجمہ: اگر کوئی بندہ حق تعالیٰ کے جمال کی آرزو کرتا ہے، اسے دیکھنا چاہتا ہے، اسے کہیے کہ وہ پہلے اپنے آئینۂ دل کا زنگ اُتار کر اسے صیقل کرے۔

در برونِ پردہ باشد این ہمہ خوف و رجا
در درونِ پردہ رو کانجا است امید و نہ بیم

ترجمہ: پردے کے اندر یعنی اللہ کی پناہ میں آ جاؤ تو وہاں پر امید و بیم کی کوئی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔

من اول و من ظاہر و من باطن
جملہ منم و جز من یک ذرہ تو بنما کو؟

ترجمہ: میں اول بھی ہوں، میں آخر بھی ہوں، میں ظاہر بھی ہوں اور باطن بھی ہوں۔ سب کچھ میں ہی ہوں۔ میرے بغیر کوئی ہے تو دکھاؤ وہ کہاں ہے؟(۱۸)

مندرجہ بالا اشعار میں جناب غوث الاعظمؒ نے صفائیِ قلب، مایوسی سے دور رہنے اور دعائے نیم شبی کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور انسان کو بتایا ہے کہ تمام دنیاوی سہاروں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے خدا کی پناہ میں آ جاؤ کیوں کہ انسان سے محبت اور پیار خدا سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ خدا کی پناہ میں آنے والا بہت سی تکلیفوں سے بچ جاتا ہے۔ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات نے لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لگایا کیوں کہ وہ انسان کو اپنی ہی جیسی ہستی کا محتاج دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اگر چہ انھوں نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی لیکن دنیا کی پرستش اور اس سے دلی محبت رکھنے سے منع فرمایا کیوں کہ دنیا اُسی کی خدمت کرتی ہے جو عاجزی سے حق تعالیٰ کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور دنیا کے دروازے پر کھڑا ہونے والے کو ذلیل کرتی ہے۔ اور بقول عبدالمجید سندھی:

''آپ نے بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا، آپ نے حکام اور خلیفۂ وقت کی

Marfat.com

کارگزاریوں اور زیادتیوں پر ان کو تنبیہ کی اور ان کے غلط فیصلوں اور غلط کاموں کی مذمت کی۔''(۱۹)

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس ہر طرف، ہر ملک اور علاقہ کے لوگ فیض حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ اس طرح ان کی تعلیمات کی بدولت فضلاء اور صلحاء اور صوفیہ کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی۔ اس جماعت کے افراد نے اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں خدمات انجام دیں اور مخلوقِ خدا کی کثیر تعداد نے ان سے علم و عرفان حاصل کیا۔ عبدالمجید سندھی کہتے ہیں:

''آپ کے وعظ اور شخصیت میں بڑی تاثیر تھی۔ آپ کا وعظ سننے کے لیے لوگ دور دراز علاقوں سے بہت بڑی تعداد میں آتے تھے۔ وعظ سننے کے دوران لوگ وجد میں آ کر بے خود ہو جاتے تھے۔ ہفتہ میں تین بار جمعہ کی صبح، شنبہ کی شام اور یک شنبہ کی صبح کو اپنے مدرسہ اور خانقاہ میں وعظ فرماتے تھے۔ آپ کی زبان سے کلمۂ بد کبھی نہیں نکلا۔ اپنے نفس کے لیے کبھی کسی پر غصہ نہ کیا۔ مگر جب کوئی محارمِ الٰہی کی بے حرمتی کرتا تو آپ سختی سے گرفت کرتے۔''(۲۰)

آپ کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادوں اور مریدینِ خاص نے قادریہ سلسلہ کی نشر و اشاعت کا کام جاری رکھا۔ اُن کے صاحبزادگان بالخصوص شیخ عبدالرزاقؒ اور شیخ عبدالعزیزؒ نے قادریہ سلسلہ کی اشاعت میں بڑی کوشش کی اور آپ کی تعلیمات کو آگے بڑھانے میں کام کیا۔ سلسلہ کے عروج کی صدی پندرھویں صدی ہے۔ اس صدی میں اسلامی دنیا کے دور دراز علاقوں میں قادریہ سلسلے کے مراکز قائم ہو گئے۔ شام اور عراق میں قادریہ سلسلے کے صوفیہ بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ ترکی میں شیخ اسماعیل رومیؒ، (م ۱۶۴۳ء) کی کوششوں سے سلسلہ کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا اور اُن کی کوششوں سے کم و بیش چالیس قادری تکیے قائم ہوئے۔ قادریہ سلسلہ کی شاخیں مختلف ناموں سے یمن، سوڈان، الجیریا، تیونس اور مصر وغیرہ میں قائم ہوئیں اور غوث الاعظمؒ کی تعلیمات کو پُر جوش طریقے پر پھیلایا گیا۔

Marfat.com

سلسلۂ قادریہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے اور ان کے بعد حضرت حسن بصری، شیخ حبیب عجمی، شیخ داؤد طائی، شیخ معروف کرخی، حضرت شیخ جنید بغدادی، شیخ ابوبکر شبلی، شیخ عبدالواحد تمیمی، شیخ ابوالفرح طرطوسی سے ہوتا ہوا شیخ ابوسعید مخزومی تک پہنچتا ہے۔ مذکورہ بزرگوں میں سے کچھ سے الگ الگ صوفیانہ سلسلے بھی جاری ہوئے جو قادریہ سلسلے کی شاخیں تھیں۔ ان میں حضرت شیخ حبیب عجمی سے چلنے والا سلسلہ حبیبیہ، حضرت شیخ معروف کرخی سے چلنے والا سلسلہ کرخیہ، حضرت شیخ سری سقطی سے سلسلہ سقطیہ اور حضرت جنید بغدادی سے جنیدیہ مشہور ہیں۔ موجودہ دور میں سلسلۂ قادریہ کا مشہور سلسلۂ جلوّیہ ہے جو حضرت امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب سے چلا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔تاریخ مشائخِ چشت،جلداوّل۔ادارۂ ادبیات دِلّی،ص۱۵۳۔

۲۔ مذکورہ حوالہ،ص۱۵۵۔

۳۔ سیرالاولیاء بحوالہ تاریخ مشائخِ چشت،جلداوّل۔ص۱۵۸۔

۴۔ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ۔مطبع احمدی، ۱۳۱۱ھ۔ص۳-۲ بحوالہ تاریخِ مشائخِ چشت۔جلد اوّل، ص۱۶۲۔

۵۔ مولانا عاشق الٰہی،مترجم:''فتح الرّبانی''۔دہلی:۱۳۳۹ھ،ص۵۱-۵۰ بحوالہ تاریخِ مشائخِ چشت۔ جلداوّل،ص۱۵۹۔

۶۔ مذکورہ حوالہ،ص۶۹۔

۷۔ عنایت قادری۔مقدمہ''تعلیمِ قادریہ''گوجرانوالہ:العصر پرنٹرز،۲۰۰۴ء،ص۸۔

۸۔ محمد علی چراغ،تعارف''شرح دیوان غوثِ اعظمؒ''لاہور:نذیر سنز پبلشرز،۲۰۰۵ء ص۱۱۔

۹۔ ''فتح الرّبانی''ص۴۰۳۔

۱۰۔ ''اخبارالاخیار''ص۱۳،۱۲۔

۱۱۔ ''ینبوع الغیب من فتوح الغیب''مترجم،عطا محمد۔لاہور:اشرف پریس،بارِاوّل:سنہ ندارد۔ص۱۶۔

۱۲۔ مذکورہ حوالہ۔ص۱۸-۱۹۔

۱۳۔ مذکورہ حوالہ۔ص۱۶۰۔

۱۴۔ مذکورہ حوالہ۔ص۲۹۱۔

۱۵۔ مذکورہ حوالہ۔ص۳۰۵۔

۱۶۔ مذکورہ حوالہ۔ص۳۶۴۔

۱۷۔ ''شرحِ دیوانِ غوثِ اعظمؒ''،ص۱۴۔

۱۸۔ مذکورہ حوالہ،ص۲۵۵،۱۷۹،۴۷،۴۰۔

(اشعاراورترجمہ محمد علی چراغ کی''شرح دیوان غوثِ اعظمؒ''سے لیے گئے ہیں)

۱۹۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی''پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں''لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء، ص۷۷۔

۲۰۔ مذکورہ حوالہ۔ص۷۳-۷۲۔

Marfat.com

روحانی دانشور۔حضرت امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب

اسم گرامی غلام محمد ہے اور والد کا نام میاں محمد فاضل، قوم کے راجپوت سدّیانہ، چند عرصہ چک نورنگ شاہ قیام پذیر رہے۔ بعدازاں قریباً پچاس برس تک عالی جناب قطب الاقطاب حضرت پیر سید قطب علی شاہ صاحب بخاری محلوی کے مختارِ عام رہے۔

ولادت

حضرت امام جلویؒ کی ولادت باسعادت نہایت محتاط اندازہ سے چک نمبر ۱۹۱ گ۔ب۔ مخدوماں شریف نزد کمالیہ ضلع فیصل آباد میں بروز سوموار یکم رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۱/اپریل ۱۸۹۳ء کو ہوئی۔

منبعِ اسرار مرقعِ انوارؒ کی والدہ معظّمہ ذکر فرماتی ہیں کہ ابھی حضور کی پیدائش نہیں ہوئی تھی کہ قد بالا سفید ریش اور وجیہ الشکل نورانی بزرگ سرخ آنکھوں والے اور سبز جُبّہ پہنے میرے گھر تشریف لائے اور مجھے فرمایا کہ کچھ خیرات کرو کیوں کہ آپ کے ہاں ایک ایسا صاحبزادہ پیدا ہوگا جو عارفوں اور فقیروں کا شہنشاہ ہوگا اور جس کی دائیں ران مبارک پر ایک سیاہ رنگ کا نشان ہو گا۔ بس اتنا فرما کر دروازے تک جاتے نظر آئے پھر غائب ہو گئے اور باوجود تلاش کے نہ مل سکے۔ چناں چہ آپ کی ولادت شریف پر وہی نشان مِن وعَن اُسی ران پر موجود تھا۔ (۱)

بچپن کے حالات

سبحان اللہ! سلطانِ شریعت وطریقت اور بُرہانِ محبت وحقیقت کو شریعت کا اس قدر اتباع اور پاس تھا کہ شیر خوارگی کے زمانے میں ہی جب کہ ابھی والدہ ماجدہ کی گود مبارک میں تھے تو رمضان المبارک میں دن کو دودھ چھوڑ دیتے اور بوقت افطاری نوش فرماتے۔

Marfat.com

حضور کی والدہ ماجدہ ارشاد فرماتی ہیں کہ بچپن میں حضور کے کپڑے دھویا کرتی تو کوئی مَیل نہ نکلتی تھی بلکہ جو پانی نچوڑنے پر نکلتا خوشبودار ہوتا جسے ادب کی وجہ سے یا تو میں محفوظ رکھ لیتی یا دیوار پر ڈال دیتی۔ (۲)

سلسلۂ بیعت

حضرت امام جلوی ؒ نے ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر بروز جمعۃ المبارک ۱۰ شوال المکرم ۱۳۲۴ھ بمطابق ۲۰ مئی ۱۹۰۵ء کو حضرت سید شیر محمد گیلانی ؒ فتح پور شریف (گوگیرہ ضلع ساہیوال) اوکاڑہ کے درسِ عشق میں داخل ہوکر مرید سعید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ پھر اٹھارہ برس کا طویل عرصہ اپنے پیر خانہ فتح پور شریف ہی گزارا غرضیکہ جب کبھی سندیلیانوالی شریف تشریف لاتے تو نمازِ دوگانہ پڑھتے اور فتح پور شریف جسے اپنا اصل وطن اور حقیقی گھر بنالیا تھا، وہاں پوری نماز ادا فرماتے۔ (۳)

وعظ واخلاق

فنا الرسول اور فنا فی اللہ ہونے کی یہ شان تھی کہ ظاہر شریعت مطہرہ کے سخت متبع اور باطن سراپا عشق وحقیقت تھے۔ اپنے وقت کے نرالے شہنشاہ اور قطبِ زماں تھے۔ ہمہ صفت موصوف اور محبوبی شان کے مالک کا علم علمِ لدنّی تھا جس کی گواہی پیر امام جلوی ؒ کی تصنیفات ہیں۔ مسئلۂ وحدت الوجود، رضا بالقضا، توکل، عشق اور توحید پر شریعتِ مطہرہ کے دائرہ کے اندر ایسی مفصل مدلّل بالقرآن و بالاحادیث اور زریں اقوالِ عارفین سے تقریرِ پُرتاثیر فرماتے کہ نہایت ہی تاریک اور زنگ آلود دلوں پر بھی اپنا اثر کیے بغیر نہ رہتی اور لوگ بھی کماحقہٗ ایسے دقیق ترین اور باریک مسائل کو خوب اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیتے بلکہ قبلہ امام جلوی ؒ کے تصرفِ کاملہ سے یہ تقریریں لُوں لُوں میں دھنس جاتی اور جو بھی درِ اقدس پر آتا، فیضیاب ہوکر جاتا۔ (۴)

ساری زندگی عشقِ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک قدسی صفات کے کمالاتِ حقّی وذاتی، مقامات اور شمائل وفضائل مبارکہ بیان کرنے میں گزاردی۔ قبلہ امام جلوی ؒ جملہ علومِ ظاہری و باطنی کے ماہر تھے۔ زبانِ دُرفشاں سے دن ہو یا رات، ہر وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حمد وثنا اور نعت جاری رہتی۔ کبھی کوئی خلافِ شرع کلمہ

Marfat.com

سننے میں نہ آیا۔ جس نے ایک بار قدم چھوئے، بس پھر یہیں کا ہو رہا۔ انتہائی درجہ کے کریم، رحیم اور سخی تھے۔ دوست ہو یا دشمن، غیر ہو یا اپنا، امیر ہو یا غریب، ازل سے کچھ طبع مبارک ہی ایسی پائی تھی کہ ہر ایک سے مساوی سلوک فرماتے۔ جو بھی آستانے پر آیا، ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہو گیا۔ خُلقِ محمدیؐ کا ایک ایسا مجسمہ تھے کہ چھوٹے سے لے کر بڑی عمر والے تک یکساں سلوک اور فیض پاتے۔ خندہ جبینی اور دلربا محبت کا یہ حال تھا کہ سب حضور کی فیاضیوں، ذرّہ نوازیوں اور لطف و کرم کو یاد کر کے عمر بھر سر دھنتے رہیں گے۔ دستِ سخا پر حاتم طائی قربان۔ حق وصداقت کی آواز اٹھانے والے مُرشد نے کسی کے حق میں کبھی بھی بددعا نہ فرمائی حالاں کہ گاؤں کے لوگ ساری حیاتی ایذائیں ہی دیتے رہے اور حضور نورؒ علیٰ نور ہمیشہ خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت فرماتے رہے اور سب کی دلجوئی کرتے اور کبھی بھی انھیں خشمگیں حالت میں یا ناراض ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ نہایت ہی کریم النفس اور خُلقِ عظیم کے مالک تھے۔ باطنی اندھوں اور دہقانوں میں رہنا اُنہی کی ذات کا حوصلہ اور کام تھا۔ (۵)

مریضانِ غم کے طبیب اور گنہگاروں کے اعلیٰ نصیب کا شانۂ معظّم سے علی الصبح ہی باہر بنگلہ میں تشریف لے آتے اور مشتاقانِ دیدار کے واسطے سارا دن ہی کھلا اجلاس رہتا۔ حاجت مند سوالی، عالم، زاہد اور تشنگانِ توحید غرضیکہ ہر قسم کے لوگ حاضری دیتے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق سب کی حاجتیں پوری ہوتیں۔ عصر اور مغرب کی نماز باجماعت ادا فرماتے اور نمازِ فجر اور عشاء خلوت میں ادا ہوتی۔ صرف کھانے کے وقت عصمت سرا میں تشریف لے جاتے ورنہ صبح سے عشاء تک باہر درویشوں میں رونق افروز رہتے اور صبح و شام رات دن ہر وقت عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علمِ لدُنّی اور علمِ ذوق وشوق کا رُوح پرور درس جاری رہتا۔ خط مبارک ایسا خوشنما اور خوبصورت تھا کہ بڑے سے بڑا خوشنویس بھی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا۔ لباس مبارک شریعتِ مطہرہ کے مطابق ہوتا تھا۔ کُلاہ مبارک پر دستار شریف ایسی باکمال باندھتے کہ ماشاءاللہ نظیر ملنی مشکل ہے۔ غرضیکہ ہر پہلو سے زِ احسن ہی حسن تھے اور نہایت حسین وجمیل اور پرلے درجے کے امین تھے۔ قبلہ امام جلویؒ کے مرید زمانہ بھر میں موجود ہیں جن میں اکثریت علماء کی ہے۔ بیعت کرنے کی دیر ہوتی کہ نشۂ توحید کا خمار فوراً اس دارِ فانی سے بے نیاز کر کے کسی دوسرے

Marfat.com

عالم میں لے جاتا۔ (۶)

وصال مبارک

قبلہ امام جلویؒ کا وصال پُر ملال ۶۳ برس کی عمر میں بتاریخ ۴ شوال المکرّم ۱۳۷۵ھ بمطابق ۱۵ مئی ۱۹۵۶ء بروز منگل عصمت سرا کے اندر بوقت عصر ۴ بج کر ۲۵ منٹ پر موضع جلّو آنہ شریف میں ہوا۔

ہجرت

پھر وہاں سے بتاریخ ۵ جمادی الاوّل ۱۳۹۰ھ بمطابق ۱۰ جولائی ۱۹۷۵ء بروز جمعتہ المبارک بوقت سحر ۳ بج کر ۱۵ منٹ پر بمقام محلّہ فیض پورہ (فیصل آباد) ہجرت فرمائی۔ قبلہ امام جلویؒ کا دربار گوہر بار عاشقانِ کبریا کے دلوں کے سکون کا مرکز اور مرکزِ انوارات وتجلیات فیصل آباد میں مرجعِ خلائق ہے۔

تصانیف

(۱) وصال نامہ (سید قطب علی شاہ صاحب محلّوی)
(۲) شجرۂ غوثیہ وحدت نامہ ذاتیہ
(۳) رمزالوحدت
(۴) تحقیق العارفین فی حقیقت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین (جلد اوّل)۔
(۵) تحقیق العارفین فی حقیقت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین (جلد دوم)
(۶) اسرارُ المقطعات ورموز المتشابہات منظوم عربی مع ترجمہ وتشریح سلیس اُردو
(۷) اسرارُ المقطعات ورموز المتشابہات منظوم فارسی ترجمہ مع ترجمہ وتشریح سلیس اُردو
(۸) مدیحتہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
(۹) نورِ ولایت
(۱۰) نورالایمان فی علم العرفان
(۱۱) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَخْتُوْم (مکتوبات شریف المعروف بہ تعلیم توحید و دقیق علوم)

Marfat.com

(۱۲) دیوانِ عشق

(۱۳) پیامِ جلویؒ

(۱۴) کمالِ جلویؒ

(۱۵) وصال باکمال سید شیر محمد شاہ صاحب گیلانیؒ

(ملفوظات شریف اسرارالتوحید جلد اوّل، دُوُم، سِوُم چھپ چکی ہیں اور باقی کافی جلدیں زیرِ طبع ہیں)

ملفوظات

پیرکامل کے بارے میں حضرت امام جلویؒ فرماتے ہیں:

۱) ''پیرِ کامل وہ ہے جو وجد کی حالت سے سنبھال لے اور سُکر سے صحو میں لے آوے۔''(۷)

۲) ''پیر کا تصور ہر ایک خیال سے اچھا ہے۔''(۸)

خلافت اور اہلِ علم کے بارے میں فرماتے ہیں:

۳) ''اصل چیز کمال ہے خلافت نہیں ہے۔''(۹)

۴) ''اہلِ علم نِرا غرور ہوتے ہیں مگر جن میں اللہ کا عشق اور فضل ہو وہ نورٌ علیٰ نور ہوتے ہیں۔''(۱۰)

عبادت پر عرفان کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

۵) ''جو کچھ ہے عرفان ہے نہ کہ عبادت۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کو جو باقی مخلوق پر یا ایک دوسرے کے مقابلے میں شرف اور فضیلت حاصل ہے وہ عرفان سے ہے نہ کہ عبادت سے۔ معرفت کے مقابلے میں عبادت کوئی شے نہیں ہے۔ حقیقتاً جس عبادت میں عرفان نہ ہو وہ کوئی عبادت نہیں ہے۔ انسان جو باوجود گناہوں کے ملائکہ پر سبقت لے گیا ہے وہ فقط عرفان سے ہے نہ کہ عبادت سے، ورنہ ملائکہ کی عبادت کا مقابلہ انسان کیا کر سکتا ہے۔''(۱۱)

محبت اور عشق کے متعلق فرماتے ہیں:

Marfat.com

۶) ''محبت ایسا جوہر ہے جس میں ریا نہیں ہوسکتا۔ یہ نرا اخلاص اور خلوص ہے۔''(۱۲)

۷) ''تمام ریاضات محنت مشقت ذکر اذکار اور ورد و وظائف کا اصلِ اصول اور حقیقی جوہر محبت ہے۔''(۱۳)

انسان کے بارے میں فرماتے ہیں:

۸) ''انسان یوں ہی اپنے آپ کو ایک جسمِ صغیر سمجھے ہوئے ہے حالاں کہ اس کے اندر ایک عالمِ اکبر سمٹا ہوا ہے۔ کوئی شے اِس کے خارج میں نہیں ہے، سب کچھ اس کے اندر ہے۔ انسان کے وجود کے اندر تمام اعضاء سے آنکھ کی پُتلی چھوٹی ہے مگر تمام جہان کا نظارہ کر رہی ہے۔ اس پُتلی کو بھی انسان کہتے ہیں۔ چھوٹے بڑے پر مدار نہیں ہے۔ عالمِ مُلک اِنسان کے اندر ہے، عالمِ جبروت اِس کے اندر ہے، عالمِ ملکوت اِس کے اندر ہے، ہاھُوت اِس کے اندر ہے، عرش، کرسی، لوح، قلم غرضے کہ سب کچھ اسی کے اندر ہے۔''(۱۴)

دنیا کو دل میں رکھنے سے منع فرمایا:

۹) ''دنیا کو گھر میں رکھو، ہاتھ میں رکھو، جیب میں رکھو، جہاں مرضی ہے رکھو فقط ایک دل میں نہ رکھو۔ دل محض خدا کی جگہ ہے۔ ویسے بڑی خوشی سے دنیا کو استعمال کرو کیوں کہ ''ورتن دی چیز ہے اور اللہ تساڈی خاطر پیدا کیتی ہے'' لیکن دنیا کے ساتھ محبت نہ لگاؤ، یہ زہر ہے۔ انسان اگر سیر زہر کا ہاتھ پر لیے پھرے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جوں ہی کھایا تو گیا..... دنیا خدا کے نزدیک کوئی چیز ہوتی تو کفار کو ذرّہ بھر نہ دی جاتی اور سب انبیاء علیہم السلام اور اولیاءؒ کو دی جاتی بلکہ ہمارے حضور پاک سائیںؒ فتح پور شریف والے فرمایا کرتے تھے کہ اگر دنیا کا ذکر کرنا ہی پڑے تو نفرت سے کیا کرو۔ دنیا مردار ہے اور مردار سے انسان کو بُو آتی ہے اور اس کے چاہنے والے کُتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار کو دنیا نہ سمجھو یہ کسب کرنا تو سنت ہے۔''(۱۵)

دِل کو خدا کی محبت کے لیے مخصوص کرنے کے بارے میں فرمایا:

۱۰) ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے کسی وجود میں دو دل پیدا نہیں کیے بلکہ ہر پہلو میں ایک

Marfat.com

ہی دل ہے اور ایک دل میں محبت ایک ہی سما سکتی ہے۔ لہٰذا دل اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہے۔''(۱۶)

معرفتِ الٰہی کو اصل علم کہتے ہوئے علمِ ہدایت حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۱) ''جس علم سے حقیقت کی شناسائی نہ ہو اُس سے جہل ہزار درجہ بہتر ہے'' نیز فرمایا

۱۲) ''معرفتِ الٰہی اصل علم ہے۔ انسان کا سب سے پہلا فرضِ منصبی ہی یہی ہے کہ علمِ ہدایت حاصل کرے۔''(۱۷)

شریعت اور حقیقت دونوں کا لحاظ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

۱۳) ''کامل وہ ہے جو شریعت اور حقیقت دونوں کا لحاظ رکھے۔ ظاہر میں شریعت ہو اور باطن میں حقیقت ہو، ظاہر کا اثر باطن پر نہ ہونے دے اور باطن ظاہر میں مخل نہ ہو۔''(۱۸)

انسان اور تن کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

۱۴) ''تن تو فقط ایک سواری ہے اور مرکب ہے اور یہ تمام اعضاء ہاتھ پاؤں منہ کان آنکھیں ناک وغیرہ ہتھیار ہیں۔ ان تمام اعضاء کے مجموعہ کا نام تن ہے جو کہ فقط ایک سواری ہے۔ انسان وہ ہے جو اس سواری پر راکب ہے اور وہ حضرتِ رُوح ہے جسے حکم ہے کہ اِن ہتھیاروں ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ سے کام لے، لہٰذا جو چیز سمجھ رہی ہے وہ انسان ہے۔ منزلیں ادراک میں ہیں نہ کہ تن میں۔ پس قوت درّاکہ کا نام انسان ہے۔''(۱۹)

ذوق کے بارے میں فرمایا:

۱۵) ''اصل چیز ذوق ہے اور یہی ذوق ہی تمام حیاتی کا خلاصہ ہے۔ یہ کوئی معمولی چیز اور تضیعِ اوقات نہیں ہے۔''(۲۰)

دشمنی اور عیب جوئی سے منع فرمایا:

۱۶) ''اوروں کے عیب نہ تلاش کرو۔ آپس میں دشمنی نہ رکھو۔''(۲۱)

Marfat.com

یہ تمام ملفوظات مجالس میں ہونے والی گفتگو سے اخذ کیے گئے ہیں۔

حضرت امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب نہ صرف بیسویں صدی کے تصوُّف میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں بلکہ شاعری اور خطوط نویسی میں بھی کمال کے درجے پر ہیں۔ وہ اُردو کے علاوہ پنجابی، فارسی اور عربی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری پنجابی، اُردو اور فارسی تینوں زبانوں میں ہے۔ حضرت امام جلویؒ کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد اُن سے بطور شاعر، انشا پرداز، مترجم، مفسر، محقق اور خطوط نگار کے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ عاشقِ رسول کا حوالہ بھی بہت اہم ہے۔

بطور شاعر

اُردو شاعری کے حوالے سے اُن کی دو کتابیں اہم ہیں:

(ا) **دیوانِ عشق**: دیوانِ عشق میں اُردو غزلوں کے ساتھ فارسی غزلیں بھی ہیں لیکن ہم یہاں اُردو غزلوں کے موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

ا) عشق اور مقامِ انسان ۲) شانِ غوث الاعظمؒ ۳) وحدت الوجود
۴) شاعرانہ تعلّی اور شان کا بیان ۵) انکسارِ طبیعت ۶) مرشد کی محبت
۷) سراپا نگاری ۸) سجدۂ تعظیمی ۹) عاشقِ رسولؐ

مذکورہ موضوعات پر اشعار کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

میں ہوں غلام سیّدِ خیرالانامؐ کا
بندہ ہے بادشاہ میرے ادنیٰ غلام کا

(غزل نمبر۲۔ص۲)

اے دست گیرِ عاجزاں پشت و پناہِ بے کساں
ہوں سگ تیرے دربار کا یا غوثِ اعظمؒ الغیاث

(غزل نمبر۲۱۔ص۱۹)

ہوا جب نورِ احدیت سے پیدا نور وحدت کا
تو ظاہر واحدیت سے ہوا گلزار کثرت کا

(غزل ۱۸۔ص۶)

Marfat.com

ہوں بظاہر غلامؔ و باطن میں
دونوں عالم کے بادشاہ ہیں ہم

(غزل۵۰۔ص۳۹)

بظاہر میں تو بندہ ہو خدا ہو عین باطن میں
یہ ہے معنی حقیقت کا وہ ہے مسئلہ شریعت کا

(غزل۸۔ص۶)

روزِ ازل سے ہوں میں غلامِ محمدیؐ
ہمسر نہیں کوئی میرے اعلیٰ نصیب کا

(غزل۶۔ص۵)

عالم تو ہے مرید میرے پیر کا غلامؔ
وہ ہے مراد حضرتِ ذاتِ قدیر کا

(غزل۱۰۔ص۸)

رنگت میرے صنم کی لالہ میں ہے نہ گُل میں
قد کی مثال زیبا سروِ چمن نہیں ہے

(غزل۶۸۔ص۵۱)

شاہانِ ہفت کشور عالم کے اے غلامؔ
خاکِ درِ رسولؐ پہ سَر دیکھتا ہوں میں

(غزل۸۔ص۶۸)

.....

دیوانِ عشق کے صفحہ ۶۳ سے ۷۰ تک کی دس غزلیں طرح مصرعوں پر تیار کی گئیں جو زراعتی کالج فیصل آباد (سابقہ لائل پور) کے کئی مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ ''دیوانِ عشق'' اشرف

Marfat.com

پریس لاہور سے ۱۳۸۱ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

(۲) رمزالوحدت: اُردو شاعری کی اس کتاب میں متصوفانہ نکتے اور اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ حقیقت کے اسرار و رموز سوال و جواب کی شکل میں ہیں۔ تفصیل سے وجود کے مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ حاشیہ میں تشریح بھی کی گئی ہے۔ تشریح میں بڑے بڑے صوفیہ کے اقوال بھی دیے گئے ہیں۔ قاری کے لیے تشنگی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وحدت کی رمز یعنی فلسفۂ وحدت الوجود کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ''رمزالوحدت'' کے مضامین سے آگہی کتاب کے آخر میں دی ہوئی فہرست سے ہوتی ہے۔ فہرست درج ذیل ہے:

۱) رمزالوحدت
۲) در بیان مسئلہ وحدۃ الوجود مع دلائل القرآن
۳) در بیان تمثیلات وحدۃ الوجود
۴) مثالِ موم و اشکالِ آن
۵) مثالِ بحر و امواجِ آن
۶) مثالِ آب و حُباب
۷) مثالِ بحر و آب
۸) مثالِ سیاہی و حروفِ آن
۹) مثالِ نقطہ و قرآن
۱۰) مثالِ بیج و درخت
۱۱) مثال کپڑے و کپاس
۱۲) مثال زر و زیوراتِ آن
۱۳) مثالِ قند و کھلونے
۱۴) در بیان سوالات علماء ظواہر بر قائلانِ وحدۃ الوجود و جوابات آں
۱۵) سوال نمبر اوّل و جوابِ آن
۱۶) سوالِ دوم و جوابِ آن

Marfat.com

۱۷) سوالِ سوم و جوابِ آن

۱۸) سوالِ چہارم و جوابِ آن

۱۹) سوالِ پنجم و جوابِ آن

۲۰) سوالِ ششم و جوابِ آن

۲۱) سوالِ ہفتم و جوابِ آن

۲۲) سوالِ ہشتم و جوابِ آن

۲۳) سوالِ نہم و جوابِ آن

۲۴) سوالِ دہم و جوابِ آن

۲۵) دَر بیانِ تنزّلاتِ خمسہ بالا جمال

۲۶) دَر بیان مراتبِ وُجود بالتفصیل

۲۷) دَر مرتبہ احدیت

۲۸) دَر بیان مرتبۂ وحدت

۲۹) دَر بیان مرتبۂ واحدیت

۳۰) دَر بیان عالمِ اَرواح

۳۱) دَر بیان عالمِ مثال

۳۲) دَر بیان عالمِ اجسام

۳۳) دَر بیانِ مظہر جامع انسان

۳۴) دَر بیان ذکر پاس انفاس ونفی اثبات

۳۵) دَر تفسیر حدیث **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ**

۳۶) دَر بیان تفسیر **الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ**

۳۷) دَر بیان ذِکر

۳۸) دَر بیانِ معرفت

۳۹) دَر بیانِ قُرب

Marfat.com

۴۰) دَر بیان معیّت
۴۱) دَر بیان عینیّت
۴۲) دَر بیانِ حُسن
۴۳) دَر بیانِ عشق
۴۴) دَر بیانِ نصیحتِ خاص پنجابی
۴۵) دَر مدحت مُرشدی ومولائی
۴۶) خاتمہ
۴۷) شجرۂ غوثیہ وحدت نامہ ذاتیہ
۴۸) نسب نامہ جناب غوثیت مآب مخزنِ علوم سبحانی مرشدنا ومولانا حضرت سید شیر محمد صاحب گیلانی

حسن وعشق کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

شوخ نگاہیں غاصب دین غارت گر ایمان و یقین
نقشِ قدم پر ہیں قربان حُور ملائک جن اِنسان
مورت کیا ہے جان جہان ظاہر باطن حق کی شان
(ص۹۵۔۹۶۔۹۷)

عشق ہے اللہ عشقِ رسولؐ عشق ہے مایہ عشق ہے مُول
عشق ہے واجب عشق قدیم عشق ہے اعلیٰ عشق عظیم
عشق ہے جادو عشق فسُون عشق ہے سودا عشق جنون
عشق ہے مذہب عشق ہے دین عشق ہے ایمان عشق یقین
عشق ہے رہبر عشق ہے پیر عشق ہے مولا عشق فقیر
عشق ہے رحمت عشق ہے نُور عشق ہے لذّت عشق سرُور
عشق ہے وجد اور عشق ہے حال عشق حضوری عشق وصال
(ص۹۸۔۹۹)

Marfat.com

پنجابی شاعری

نورِ ولایت

اشرف پریس لاہور کی مطبوعہ پنجابی شاعری کی کتاب ''نورِ ولایت'' ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سی حرفیاں اور کافیاں ہیں۔ سی حرفیوں میں تصوُف کے رموز آسانی اور خوبصورتی سے بیان ہوئے ہیں۔ مراتبِ ستہ کا بیان اُن کے عنوانات کے ساتھ ہوا ہے جیسے (۱) در تعریف احدیّت۔ (۲) در تعریف وحدت۔ (۳) در تعریف واحدیّت۔ (۴) در تعریف عالم الارواح۔ (۵) در تعریف عالم امثال۔ (۶) در تعریف عالم الاجسام۔ (۷) در تعریف حضرت الانسان۔

سی حرفیوں کے موضوعات میں علمِ الٰہی، انسانِ کامل، لوحِ محفوظ، عشق، طلب اور مُرشدِ حقیقی جیسے موضوعات بھی ہیں۔ موضوعات عنوانات کی شکل میں بھی لکھے گئے ہیں۔ کچھ سی حرفیاں بغیر عنوان کے ہیں۔

اشعار سی حرفی ملاحظہ کریں۔

الف احد بن احمدؐ آیا میم دا برقع پا کے ویس وٹا کے
عین عرب دی صورت وچہ رب آیا کُن فرما کے بھید چھپا کے
الف الٰہی لام دو عالم میم محمدؐ پا کے سمجھ ولا کے
غلام محمدؐ ظاہر ہویا رب احمدؐ وچہ آ کے پڑھ لولاکے

ب بسم اللہ دا خود نقطہ ذات محمدؐ ماہی قسم الٰہی
اِس نقطے تھیں ظاہر ہوئی خلقت ناتمناہی جو رب چاہی
باجھ محمدؐ سرور عالم ہرگز مول نہ، آہی قلم سیاہی
غلام محمدؐ لَولاکَ لَمَا خود فرمان الٰہی صحیح گواہی
(ص ۲۶۔۲۷)

Marfat.com

نورِ ولایت میں سی حرفیوں کے علاوہ کافیاں بھی ہیں۔ کافیوں کا مرکزی مضمون پیر کی محبت ہے۔ یہ محبت عشقِ رسولؐ اور عشقِ الٰہی میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

شیرنؒ میرا پیر نی
آیا ویس وٹا کے
شیر محمدؐ شیر الٰہی ساگی پاک محمدؐ ماہی
آیا آپ قدیر نی بُرقع میم دا پا کے.....
کملی پہن مزمّل والی آیا دِین دُنی دا والی
کر چادر تطہیر نی طٰہٰ تاج ٹھہا کے.....
شیر محمدؐ پیر گیلانی خادم جس دا شمس نورانی
صورت بدر منیر نی ویکھو گھنڈ لہا کے.....
(ص۳۶۔۳۷)

دھن بھاگ اساڈرے مائے نی گھر پاک محمدؐ آئے نی
اَحد میم دا برقع پایا نی سوہنا احمدؐ نام دھرایا نی
بَن شیر محمدؐ آیا نی سَر چھتر لولاک جھولائے نی
سر تاج خلافت سوہے نی دل میم دے اوہلے موہے نی
(ص۴۰)

ایک سی حرفی ''ڈھولا'' کے اشعار ملاحظہ کریں:

اوّل آیا نور احدیت والا ہویا وحدت ذاتوں احمدؐ نور نرالا
تے واحدیت نوروں نُور و نُور اُجالا ڈھولا کثرت والا آیا پہن دوشالا

○

بحر وجوداں کھڑیاں کل گلزاراں ہوئے علم الٰہوں معلومات ہزاراں
کھڑیا باغ الٰہی لائے رنگ بہاراں مالی پاک محمدؐ ڈھولا شاہ ابراراں

○

Marfat.com

تانگ لوائی ماہلے عشق نہانی ۔۔۔ کُنتُ کَنزاً والا کھلا گنج معانی
آیا شاہد ذاتی بُرقع پا اِنسانی ۔۔۔ ڈھولا عین ھُواللہ ہادی شیرنؒ جانی

O

ثابت ہوئی ہکا ذات معلّٰی ۔۔۔ ہویا ہر ہر جائیں ظاہر نُور تجلّٰی
ڈٹھا عین حقیقی ہوئی خوب تسلاّ ۔۔۔ ڈھولا اوّل آخر ظاہر باطن اللہ
(ص ۵۰)

فارسی شاعری

مدیحتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اشرف پریس لاہور سے ۱۳۸۱ھ میں شائع ہونے والی یہ کتاب فارسی میں ہے۔ منظوم فارسی کلام پر مشتمل اس کتاب کا نعتیہ رنگ ہے۔ امام جلویؒ پیر غلام محمد کی یہ شاعری عشقیہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عشقِ رسولؐ یقیناً بہت بڑی دولت ہے۔ عشق رسولؐ پر فخر کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں:

تا نامِ ما غلامِ محمدؐ نہادہ اند
سجدہ گہِ ملائکہ شد آستانِ ما
(ص ۵)

عشِ ایجادِ عالم ذاتِ تُست
نُور تو شد موجبِ اظہار ما
(ص ۳)

دِلم فدائے تو اے نازنینِ خلوتِ خاص
خوش آمد ست بمدحِ تو سورۂ اخلاص
(ص ۱۶)

Marfat.com

تا من از انوارِ دیدارِ تو مستم یارسولؐ
چشمِ دل از دیدنِ غیرِ تو بستم یارسولؐ

(ص۲۳)

عاشق و شیدائے حُسنِ پاک تو ذاتِ خدا
بندۂ درگاہِ خاص تو بُود رُوحُ الاَمِین

(ص۲۶)

زاہدان بہر عبادت رُو بقبلہ ساختہ
ہست محرابِ نماز ما خمِ ابروئے تو
قصدِ اربابِ ظواہر جانبِ بیت الحرام
سجدۂ اہلِ حقیقت در دو عالم سوئے تو

(ص۲۷)

اے بادشاہِ خُوباںؐ گر رُخ بمن نمائی
سجدہ کنم بہ پایت کہ توؐ قبلہ گاہِ مائی

(ص۲۹)

آخری غزل فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہے۔ اس غزل کے آخری دو اشعار دیکھیے:

بیار ساقی شرابِ وحدت بریز در کامِ مے پرستاں
کہ آمدہ ایم بر درِ تو گدائے جامِ شراب بن کے

رسید مژدہ بگوش جانم کہ بخش دوں گا غلام تم کو
بروزِ محشر بہ پیشِ مردم ضرور ربُّ الوہاب بن کے

(ص۳۲)

منظوم خطوط نگاری

اشرف پریس لاہور کی مطبوعہ ''پیامِ خلوص'' ۱۰۴ صفحات پر مشتمل منظوم خطوط کی کتاب

Marfat.com

ہے۔ یہ کتاب ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی۔ ۲۲ خطوط پر مشتمل اس کتاب کے پہلے سترہ خطوط منظوم فارسی میں ہیں اور باقی پانچ اُردو نثر میں ہیں۔ پہلے چھ خطوط کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھا ہوا ہے۔

حضرت امام جلوی کی شاعری کا محور پیر کی محبت ہے۔ پہلے خط میں حسنِ ازل کی تعریف کرتے ہوئے حسنِ کائنات کو بھی اُسی کے حسن کا نمونہ قرار دیتے ہوئے اپنے پیرومرشد کی تعریف کرتے ہیں:

بسے خُوبانِ عالم دیدہ بودم ز گلزارِ جہاں گُل چیدہ بودم

ترجمہ: میں نے عالم کے بہت خوبصورت اور جہاں کے باغ سے بہت پھول دیکھے بھالے تھے۔ چنے تھے۔

بآخر غارتِ دل کرد و جانم جمالِ حضرتِ پیر مغانم

ترجمہ: آخر میرے دل اور جان کو لوٹ لے میرے حضرت پیر مُغاں کا جمال گیا۔

(خطِ اوّل: ص ۶۔۷)

خطِ اوّل ایک طویل منظوم خط ہے۔ صفحہ ۳ تا ۱۵ پر محیط۔ اس خط میں پیرومرشد کی تعریف کرتے ہوئے فرشتوں کو اُن کے دروازے پر حلقہ بگوش اور خرقہ پوش اولیاء کو گدا دکھاتے ہوئے اپنی عاجزی، انکساری اور عشق کا اظہار فرمایا ہے:

ملائک بردرت حلقہ بگوشاں گدایت اولیائے خرقہ پوشاں

ترجمہ: فرشتے آپ کے دروازے پر حلقہ بگوش۔ اور اولیا خرقہ پہننے والے آپ کے گدا ہیں۔

جہاں را دستگیر و قبلہ گاہی محمدؒ شیر عالی جاں پناہی

ترجمہ: جہان کا دستگیر اور میرا قبلہ گاہ۔ حضرت محمدؒ شیر بزرگ جو میری جان کی پناہ ہے۔

حبیبِ ذاتِ رب العالمینی خطیبِ منبرِ عرشِ بریں

Marfat.com

ترجمہ: آپ ذاتِ رب العالمین کے محبوب۔ اور عرشِ بریں کے منبر کے خطیب ہیں۔

(خط اوّل: ص ۷)

پیرومرشد کے دروازے پر پڑے رہنے اور اُسی در پر ہی مرنے کی خواہش پر مبنی شعر اسی خط میں ہے:

بدہلیزِ تو ہر دم جائے گیرم کہ گر میرم تہِ پائے تو میرم

ترجمہ: ہر وقت آپ کی چوکھٹ پر جگہ پکڑوں۔ کہ اگر مرجاؤں تو آپ کے قدموں کے نیچے مروں۔

(خط اوّل: ص ۱۳)

خط دوم میں پیرومرشد کو مخاطب کرتے ہوئے سلام بھیجا ہے۔ اندازِ تخاطب ملاحظہ کیجیے:

سلام اے خسروِ خوبانِ عالم سلام اے شاہِ محبوبانِ عالم

ترجمہ: سلام ہو اے بادشاہ خوبان جہان کے۔ سلام ہو اے بادشاہ محبوبانِ جہان کے۔

سلام اے شاہبازِ لامکانی سلام اے طائرِ عرش آشیانی

ترجمہ: سلام ہو اے شاہباز لامکاں کے۔ سلام ہو اے طائر عرش پر آشیانے والے۔

سلام اے زینتِ عرشِ الٰہی سلام اے رونقِ ماہ تا بماہی

ترجمہ: سلام ہو اے زینتِ عرش خدائے تعالیٰ کے۔ سلام ہو اے رونق چاند سے لے کر مچھلی تک۔

سلام اے سروِ گلزارِ معانی سلام اے سرورِ کون و مکانی

ترجمہ: سلام اے سروِ گلشن معنوں کے سلام ہو اے سردار کون و مکان کے۔

ہزاراں سجدۂ تعظیم و تکریم ہزاراں بار التحیات و تسلیم

ترجمہ: ہزارہا سجدے تعظیم و تکریم کے۔ ہزارہا بار تحیّۃ اور سلام

(خط دوم: ص ۱۶)

Marfat.com

خط سوم میں پیرومرشد کے حسن پر تمام حسینوں کو قربان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہمہ خوباں فدائے روئے پاکت ہمہ شاہاں گدائے کوئے پاکت

(خط سوم: ص ۲۳)

''مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے'' کا اظہار خط چہارم کے ان جملوں سے ہوتا ہے جو منظوم خط سے پہلے لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''بعد قدم بوسی و ہزاراں ہزار سجوداتِ مریدانہ و کورنشاتِ مودبانہ دست بستہ بکمال ادب التماس ہے آنکہ یہ سگِ دربان حضور والا شان سے رخصت ہو کر آدھی رات خانیوال پہنچا وہاں دلِ حزیں اس قدر غمگین ہوا کہ روتے روتے دل بے تاب ہو گیا پھر ملتان آیا اور پشاور والی گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ قسمت کی خوبی سے ایک ہندولڑکا خلعت محبوبی پہنے ہوئے بخصائل حمیدہ و شمائل پسندیدہ آراستہ پیراستہ تختہ بالائی پر جلوہ افروز دکھائی دیا۔ دلِ حیران کو قطرہ جمالِ آن ذات بابرکات پر اطمینان حاصل ہوا۔ آخر وہ لیّہ سے پرے جا کر اتر گیا اور دعا گو اپنا دل سنبھال کر آگے روانہ ہوا۔ تو معاً صورتِ مجاز معنی حقیقت سے منتقل ہونے لگی اور مندرجہ ذیل مکتوب بلاتکلف خود بخود سمندرِ دل سے کنارۂ زبان پر جاری ہو گیا۔''(۲۲)

(خط چہارم: ص ۲۸۔۲۹)

نثر کی مذکورہ عبارت کے بعد پورا خط منظوم ہے۔ ایک شعر میں اسی خط میں اپنے مغلوب الحال ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور خداوند تعالیٰ سے درگذر کی درخواست کرتے ہیں۔

الٰہی در گذر از قیل و قالم کہ من در گفتگو مغلوب حالم

(خط چہارم: ص ۳۱)

صوفیانہ شاعری میں ''ساقی'' محبوبِ حقیقی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور پیرومرشد کو

Marfat.com

بھی ساقی کہا گیا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں ''ساقی'' پیرومرشد کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

بیا ساقی بدہ جام خمارم کہ از روزِ ازل در انتظارم

ترجمہ: آ ساقی مجھے شراب کا پیالہ دے۔ کہ میں روزِ ازل سے انتظار میں ہوں۔

بیا ساقی طلبگارِ تو ہستم کہ از روزِ الست ایں حال مستم

ترجمہ: آ ساقی میں تیرا طلبگار ہوں۔ کہ روزِ الست سے اسی حال مست ہوں۔

بیا ساقی درِ مَے خانہ بکشا بہ مَے خورانِ عالم رحم فرما

ترجمہ: آ ساقی شراب خانے کا دروازہ کھول۔ اور مَے خورانِ عالم پر رحم فرما۔

(خط ششم: ص ۴۳)

بیا ساقی بیا اے نازنین دوست بدہ جامے کہ کوثر تشنۂ اوست
بیا ساقی بیا جانم علیل ست بدہ جامے کہ روحِ سلسبیل ست
بیا ساقی بیا اے رشکِ خورشید بدہ جامے کہ بینم روئے اُمید
بیا ساقی بیا پیر خرابات بدہ جامے کہ ہستم تشنہ ہیہات
بیا ساقی بیا پیرِ مُغانم بدہ جامے مَے آتش نشانم
بیا ساقی بیا پیرِ طریقت بدہ جامے مَے تابِ حقیقت

(خط ہفتم: ص ۵۰)

خط ہشتم میں پیر کو شاہدِ نازک خیالاں، دلبرِ آشفتہ حالاں، کعبۂ حاجاتِ عالم اور آشنائے بحرِ عرفاں کہا ہے۔

انشا پردازی یا بطور انشا پرداز

حضرت امام جلوی کی عمدہ نثر کے نمونے نہ صرف اُن کی نثر کی کتابوں میں ملتے ہیں بلکہ ''پیام جلوی'' کے نثر میں لکھے خطوط میں بھی اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اکیسویں خط میں

Marfat.com

لکھتے ہیں:

''الحمدللہ کہ قناعت میں نہایت اچھی گزرتی ہے۔ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللہ نے خوب مزہ چکھا رکھا ہے۔ سحابِ رحمت کی گھٹا چھا رہی ہے۔ جنابِ عزت سے ندا آ رہی ہے۔ میخانۂ وحدت کا در کھلا ہے۔ شرابِ محبت کا جام پُر ہے۔ نشۂ توحید کی کیفیت طاری ہے۔ هَلْ مِنْ مَّزِیْد کی آواز جاری ہے۔ بے نیازی کا تاج برسر ہے۔ عشقبازی کی خلعت دَر بر ہے۔ شادمانی عشق و مستی میں ہے۔ زندگانی فراخ دستی میں ہے۔ یار جانی ہماری ہستی میں ہے۔ ہم حضرتِ عشق کے دیوانے ہیں۔ ہم شمعِ حُسن کے پروانے ہیں۔ ہم اسرارِ حق کے خزانے ہیں۔ اے یار یہ سب مستی کے ترانے ہیں۔ خونِ جگر ہماری غذا ہے۔ دردِ دل ہماری دوا ہے۔ تو ہی محمدؐ اور تو ہی خدا ہے۔ آپ کے حق میں جو کہوں سو روا ہے۔ زبان میں تیری گفتگو ہے۔ دل میں تیری جستجو ہے۔ میرے گُل میں تیری ہی خوشبو ہے۔ میں نہیں خود تو ہی تو ہے۔ اگر میں ہوں تو تو ہے۔''(۲۳)

(خط بست و یکم: ص ۹۶۔۹۷)

مذکورہ خط میں اگلے صفحے کے چند جملے ملاحظہ کریں:

''میرا دل آپ کے حسن کا دیوانہ۔ میری روح آپ کے عشق میں یگانہ۔ میرا سینہ آپ کے اسرار کا خزانہ اور میری صورت آپ کے ظہور کا بہانہ ہے۔ سبحان اللہ یہ بھی عجب افسانہ ہے۔ اے یار آپ کی آنکھیں مست دل کا مَے خانہ ہیں اور آپ کی زلفوں میں مُرغِ روح کا آشیانہ ہے۔ معرفت خوب ہے مگر محبت نہایت مرغوب ہے۔''(۲۴)

حضرت امام جلویؒ کی شاعری اور نثر کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ پیر کے عشق میں ڈوب کر ہی فنافی الرسولؐ اور فنافی اللہ کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ پیر سے عشق کا یہ عالم ہے کہ پیر و مرشد حضرت سید شیر محمد شاہ گیلانی فتح پوری کی وفاتِ حسرت آیات کے حالات پر مشتمل ۵۲ صفحات

Marfat.com

پر مشتمل ایک رسالہ ''وصال باکمال'' لکھتے ہیں۔اس ذکر کا مقصد بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''میرا مقصود صرف ذکرِ وفاتِ حسرت آیات ہی نہیں بلکہ آں ذات جامع الصفات برگزیدۂ ذوالجلال کی عزت وعظمت اور شان وشوکت اور قدر ومنزلت کا اظہار بھی دلی مطلوب ہے تا کہ پُرغم تذکرۂ جدائی کے ہمراہ آپ کے کمالاتِ انسانی وحیاتِ جاودانی کا مژدۂ جانفزا بھی ہر کس کو سنا دیا جائے تا کہ اُس عالی جناب کے ارادت مندوں اور بارگاہِ غوثیت مآب کے بندوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سلسلۂ فیضان تا ابدالآباد ویسا ہی جاری رہے گا جیسا کہ پہلے تھا بلکہ بوجہ انقطاعِ تعلق جسمانی اُس مصدرِ فیوضاتِ یزدانی کے فیضانِ باطنی کا سلسلہ روز افزوں ترقی پر ہوگا۔اور یہ مسلمہ بات ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ سنتِ الٰہی اس طرح جاری ہے۔آمین ثم آمین''(۲۵)

روزِ وصال کا ذکر کرتے ہوئے دوستانِ خدا کی موت کو ایک ایسا پُل قرار دیتے ہیں جو عبور کرنے کے بعد دوست دوست سے جاملتا ہے۔فرماتے ہیں:

''دوست جو اپنے کسی دوست کے لیے ملاقات کا دن مقرر کرتا ہے تو اُس دن کا انتظار موت سے زیادہ سخت ہوا کرتا ہے۔دوستانِ خدا کی موت جو دراصل موت نہیں بلکہ یار کو یار سے ملا دینے والا ایک پُل ہے جس پر سے جلد گزر کر اپنے دوست سے جاملنا اُن کی دِلی آرزو ہوتی ہے۔''(۲۶)

وفات کی خبر مریدوں پر جس طرح اثر انداز ہوتی ہے،اُس کا حال بیان کرتے ہیں:

''دردمندوں کے دل جو آپ کی زنجیر، زلفوں کے قیدی اور تیز نگاہوں کے زخمی بنے ہوئے تھے، نیم بسمل ہو کر تڑپنے لگے اور اُس سلطانِ خوباں کے ناز وادا اور بادشاہ محبوبوں کے لطف وعطا یاد کر کے زار زار رونے لگے، یہاں تک کہ آنکھوں نے آنسوؤں سے دلوں کے آبگینوں کو دھو ڈالا اور حسنِ ذات کے پجاری اپنے ہی سینوں کے آئینوں میں جمالِ شیخ کا جلوہ

Marfat.com

دیکھنے لگے۔''(۲۷)

مندرجہ بالا عبارت نہ صرف مریدوں کی کیفیت کو بیان کرتی ہے بلکہ عمدہ نثر کا ایک نمونہ بھی ہے۔ قبلہ امام جلویؒ اپنے پیرو مرشد کے اوصاف بیان کرتے ہوئے پیر صاحب کی وحدت الوجود کے بیان میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اسرار و رموزِ تصوُّف کو اس طرح بیان فرماتے کہ جاہل سے جاہل لوگ بھی آپ کی تقریر پُر تاثیر سے اہلِ عرفان بن جاتے اور بڑے بڑے عالمِ ظاہر پرست آپ کے کلامِ معجز نظام کی عظمت سے حیران رہ جاتے۔(۲۸) آپ کی شیریں زبانی سے ہر مغموم کا غم دور اور رنجیدہ دل مسرور ہو جاتا۔ جب آپ کے سینۂ فیض گنجینہ سے اسرارات الٰہی کا سمندر موجزن ہوتا تو حاضرین کے دلوں کی زمین میں علم و معرفت کے دریا بہا دیتے۔(۲۹) پیرو مرشد کے صبر و استقلال اور مقامِ رضا بالقضا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سبحان اللہ آپ کے صبر و استقلال کی یہ کیفیت اور مقامِ رضا بالقضا کی یہ کمالیت تھی کہ قسم قسم کی رنج و تکلیفوں اور طرح طرح کی درد و مصیبتوں نے آپ کا استقبال کیا اور اس مردِ میدانِ محبت نے کمال شفقت سے اُنھیں اپنے گلے لگالیا۔''(۳۰)

حضرت امام جلویؒ پیر اور مرید کے رشتے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''مرید اپنے پیرِ کامل کا فرزندِ معنوی ہوتا ہے جیسا کہ ظاہری باپ اپنے بیٹے کے جسم کی تربیت کرتا ہے معنوی باپ یعنی پیرِ کامل اپنے مرید کی روح کی تربیت فرماتا ہے۔''(۳۱)

حضرت امام جلویؒ کی اپنے پیر سے محبت کا یہ عالم ہے کہ تدفین کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صرف اہلِ زمین ہی کی آنکھوں میں اندھیرا نہ چھا گیا بلکہ گنبدِ آسمان بھی اُس رشکِ جلوۂ طور کے بغیر بے نور بن گیا۔ چناں چہ اُسی شب چاند کو گہن لگا اور پیرِ فلک نے بھی آپ کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا۔''(۳۲)

Marfat.com

پیر کی محبت میں ڈوبی ہوئی مذکورہ عبارتیں ایک مرید کی کیفیت کو ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ شاعرانہ نثر کا نمونہ بھی ہیں۔

مترجم، مفسّر اور محقّق

حضرت امام جلویؒ صرف شاعر اور خطوط نگار ہی نہیں بلکہ وہ مترجم اور مفسّر کی حیثیت سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی دو کتابیں اہم ہیں:

۱) اسرارُ المُقطّعَات ورُموزُ المتشابہات منظوم فارسی مع ترجمہ وتشریح سلیس اُردو
۲) اسرارُ المُقطّعَات ورُموزُ المتشابہات منظوم عربی مع ترجمہ وتشریح سلیس اُردو

اِن کتابوں میں قرآنِ مجید فرقانِ حمید کے حروفِ مقطعات کی تفسیر ہے۔ پہلی کتاب ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی اشرف پریس لاہور کی مطبوعہ ہے اور اس کا سالِ اشاعت ۱۳۸۱ھ ہے۔ کتاب کا پیش لفظ عربی میں ہے۔ اُردو ترجمہ بھی ساتھ لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، حروفِ مقطعات کے بارے میں ہے اور اسرارِ قرآن مجید کے طالبان کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت امام جلویؒ لکھتے ہیں:

> ''یہ حروفِ مقطعاتِ قرآنی کے بھیدوں میں سے کچھ تھوڑا سا اور رموزِ متشابہاتِ فرقانی کے سمندروں میں سے ایک قطرہ ہے کہ اُن کے بعض حقائق اور معانی محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم سے میرے روح اور دل کے آئینہ میں منقش ہوئے ہیں۔ پس ان میں سے بعض میں نے اس کتاب میں لکھے ہیں اور اُن کا ثواب سیدِ سادات و جامع کمالات مخزنِ علومِ سبحانی اپنے مرشد و مولا حضرت سید محمد شیر گیلانیؒ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں اور آپ سے بطفیل اس ذات کے جس نے آپ کو ولیِ کامل اور اپنی ذات سے واصل بنایا ہے، سائل ہوں کہ یہ میرا ہدیہ قبول فرمالیں اور اس سے میرا ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے اور وہ مجھے کافی ہے۔''(۳۳)

حروفِ مقطعات بقول حضرت ابوبکر صدیقؓ اللہ تعالیٰ کا راز ہیں اور حضرت علیؓ کے

Marfat.com

بقول قرآنِ مجید کا خلاصہ ہیں۔ان حروف کی تشریح منظوم عربی اور فارسی میں کرنا شاعرانہ کمال تو ہے ہی مگر سلیس اُردو میں حروفِ مقطعات کی شرح اور تفسیر میں باطنی آنکھ کے نظارے کو بھی دخل ہے۔ابنِ عربیؒ، جلال الدین سیوطیؒ، حسین واعظ کاشفیؒ اور ابوبکر واسطیؒ جیسے بڑے بڑے صوفیہ کا حوالہ حضرت امام جلویؒ کے تحقیقی رجحان کا عکاس بھی ہے۔اس سلسلے میں تحقیق العارفین جلد اوّل اور جلد دوم دونوں اہمیت کی حامل ہیں۔

تحقیق العارفین حصہ دوم ۶۶۳ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جو اشرف پریس لاہور سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔یہ کتاب اُن مکاشفاتِ عالیات کا مجموعہ ہے جو کہ حضور پرنور سید المرسلین حبیبِ ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشکوۃِ نبوت سے اولیائے اکملین وعلمائے محققین کے دلوں پر منکشف ہوئے ہیں۔کتاب کے آخر میں دی ہوئی اسمائے کتب کی فہرست مع اسامی مصنفین کتاب کے مرتبہ اور مقام کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی بطور محقق اہمیت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱) محمد یوسف قادری ''ذکرِ عطا''، سالِ اشاعت ۱۴۱۱ھ، ص ۱۵-۱۶۔

۲) ایضاً-ص ۱۶۔ ۳) ایضاً-ص ۱۷۔ ۴) ایضاً-ص ۱۷-۱۸۔

۵) ایضاً-ص ۱۸-۱۹۔ ۶) ایضاً-ص ۲۰-۲۱۔

(قبلہ امام جلویؒ کے حالات ''ذکرِ عطا'' سے ہیں اور ''ذکرِ عطا'' کے مصنف میاں محمد یوسف نے قبلہ امام جلویؒ کے مرید اور عارفِ کامل میاں محمد یاروٹو صاحب کی قلمی تحریر سے نقل کیے ہیں)۔

۷) ''اسرار التوحید'' دفتر سوم حصہ اوّل، ملفوظات شریف قبلہ امام جلوی پیر غلام محمد صاحب، جمع کنندہ: میاں محمد یاروٹو، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۵۔

۸) ایضاً-ص ۷۔ ۹) ایضاً-ص ۲۷۔ ۱۰) ایضاً-ص ۲۲۔

۱۱) ایضاً-ص ۳۲۔ ۱۲) ایضاً-ص ۴۱۔ ۱۳) ایضاً-

۱۴) ایضاً-ص ۴۴-۴۵۔ ۱۵) ایضاً-ص ۵۷-۵۸۔ ۱۶) ایضاً-ص ۵۸۔

۱۷) ایضاً-ص ۷۱۔ ۱۸) ایضاً-ص ۷۲۔ ۱۹) ایضاً-ص ۷۳۔

۲۰) ایضاً-ص ۷۵۔ ۲۱) ایضاً-ص ۷۹۔

۲۲) حضرت امام جلویؒ مولانا غلام محمد صاحب ''پیام جلوی''، تاریخ اشاعت ۱۳۸۲ھ، ص ۲۸-۲۹۔

۲۳) ایضاً-ص ۹۶-۹۷۔ ۲۴) ایضاً-ص ۹۸۔

۲۵) حضرت امام جلویؒ غلام محمد صاحب ''وصال باکمال''، لاہور: اشرف پریس، ۱۳۸۲ھ، ص ۵-۶۔

۲۶) ایضاً-ص ۲۶-۲۷۔ ۲۷) ایضاً-ص ۳۳-۳۴۔ ۲۸) ایضاً-ص ۷۔

۲۹) ایضاً-ص ۸۔ ۳۰) ایضاً-ص ۱۷۔ ۳۱) ایضاً-ص ۹-۱۰۔

۳۲) ایضاً-ص ۳۹-۴۰۔

۳۳) حضرت امام جلویؒ غلام محمد صاحب ''اسرارُ المقطعات و رموز المتشابہات''، سالِ اشاعت ۱۳۸۱ھ، ص ۶-۷۔

Marfat.com

صوفیائے کرام کی لسانی خدمات

صوفی صرف اشیاء کے تعلق کو ہی نہیں جانتا بلکہ اُن کی فطرت کو بھی جانتا ہے۔ وہ عوام کے دلوں کی نگہبانی ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کے دلوں تک رسائی بھی حاصل کرتا ہے اور عوام کی زبان میں اُن کو کائناتی شعور دے کر روحانی صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رہنا سکھاتا ہے۔ صوفی انسان کے خود آگاہی ادراک کا شعور رکھتا ہے لہٰذا وہ اُنھیں روحانی توازن کے حصول کے لیے بصارت کی تہذیب کے ساتھ ساتھ سماعت کی تہذیب کا درس بھی دیتا ہے۔ زبان چوں کہ تہذیب کی نفیس ترین علامت ہے اس لیے صوفیہ نے عوام سے بات چیت کے لیے اُنہی کی زبان سیکھی۔ زبان کو سیکھنے کے ساتھ زبان کے ارتقاء میں بھی مدد دی، لہٰذا اُردو زبان کے سلسلے میں صوفیہ کی لسانی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ افتخار عارف کے بقول ''اُردو کی لسانی بنیادیں تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں ہیں اور یہ تاریخ ہمارے دینی ادب اور تصوُّف کی روایات کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔''(۱)

دلوں کو گرفت میں لینے کے لیے ہم زبانی لازمی ہوتی ہے کیوں کہ ہم زبانی کے بعد ہی ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے صوفیہ نے تلقین کے لیے اِس خطے کی زبان سیکھی اور سرزمینِ ہند میں آنے والے صوفیہ عوام سے انہی کی زبان میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے۔ (۲)

صوفیہ نے برصغیر میں تبلیغِ اسلام کے لیے یہاں کی عوامی زبان کو خود سیکھا۔ ان کے تذکروں میں ہندی گوئی یا ہندی دانی کا جو ذکر ملتا ہے اس سے مراد عربی فارسی آمیز وہی زبان ہے جو اُردو کی ابتدائی اور قدیم شکل کہلاتی ہے۔ (۳)

خواجہ معین الدین چشتیؒ اور اُن کے خلفا جب برصغیر میں آئے تو برصغیر کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی فضا ہی اُن کے لیے اجنبی نہ تھی بلکہ لسانی ماحول بھی ان کے موافق نہ تھا۔ ان کی اپنی زبان

Marfat.com

فارسی تھی لیکن مقامی لوگ اس سے ناواقف تھے۔ اس وقت پورے برصغیر میں پراکرتوں کی اپ بھرنش شاخیں رائج تھیں۔ پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جو برہمنوں کی سنسکرت پر اجارہ داری کے ردعمل کے طور پر از خود عوام میں پیدا ہوگئی تھیں۔ انہی پراکرتوں نے صدیوں کے ارتقا کے بعد جب نئی شکلیں اختیار کیں تو اپ بھرنش کے نام سے موسوم ہوئیں۔ صوفیائے چشت کی برصغیر میں آمد کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں اپ بھرنش کی مختلف بڑی اور ذیلی شکلیں رائج تھیں۔ (۴)

صوفیائے چشت کو سب سے پہلے جس علاقے کی زبان اور بولیوں سے واسطہ پڑا وہ وہی علاقہ تھا جس پر مغربی ہندی کا قبضہ تھا۔ یہ علاقہ مشرقی پنجاب میں سرہند شریف سے لے کر الہ آباد تک اور شمال میں کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کے جنوب میں بندھیاچل اور روہیل کھنڈ تک تھا۔ قنوجی، راجستھانی، دہلوی، کھڑی بولی، ہریانوی جاٹو، بنگارو اور برج بھاشا اسی علاقے کی زبانیں اور بولیاں تھیں۔ دلّی ان مختلف بولیوں اور زبانوں کا مقامِ اتصال تھا۔ ماہرینِ لسانیات کی رائے میں ان سب بولیوں اور زبانوں میں غالب اثر برج بھاشا کا تھا۔ اس برج بھاشا کا غالب اثر لیے ہوئے دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان نے ایک عرصہ بعد عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی شکل اختیار کر لی تھی جو پہلے ہندی (ہندوی) اور پھر ریختہ اور اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ (۵)

دہلی کے مسلمانوں کے قبضہ میں آ جانے کے بعد اس علاقے کی زبانوں میں خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے خلفا اور مریدوں نے کافی کام کیا ہے۔ ان میں عربی، فارسی کے الفاظ کس حد تک دخیل ہو گئے تھے اس کا اندازہ اس دور کی تصانیف سے ہوسکتا ہے۔ یہ کتابیں دوہوں کے رنگ میں قدیم بھاشا میں لکھی گئی ہیں اور ان میں عربی اور فارسی کے کئی الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان تصانیف میں ایسے پھلوں، پھولوں، اسلحہ اور لباس کے نام بھی ملتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے میں آئے تھے۔ لاہور میں شیخ علی عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوریؒ نے غیر مسلموں میں تبلیغ کے عوامی انداز سے عربی، فارسی الفاظ کو مقامی زبان میں منتقل کرنے کا غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر وسیع اور مؤثر کام کیا ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے بقول ''کسی مذہب، مسلک یا تحریک کی اشاعت اور اس کے

Marfat.com

نظریات و اصول کے دوسروں تک ابلاغ کے لیے اس کے سرپرستوں اور کارکنوں کو ایسی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کو اُن کے مخاطب آسانی سے سمجھ سکیں ورنہ قوتِ گویائی و شنوائی کے باوجود مبلّغین کی حیثیت گونگوں اور سامعین کی حالت بہروں کی سی ہوگی۔ قرآن کریم کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ اس کے ابتدائی مخاطب عرب تھے۔ اگر پیغامِ ربانی کی زبان عربی کے بجائے کوئی اور ہوتی تو یہ خداوند کریم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوتا۔ یہی صورت برصغیر میں پیش آئی ہے۔ ہمارے ابتدائی صوفیائے چشت یا ان کے خلفا نے، جو صرف عربی فارسی پڑھے ہوئے تھے، جب تک اپنے علاقے کے مخاطبین کی زبان سے واقفیت پیدا نہ کر لی ہوگی مقامی لوگوں تک اسلام اور اس کے اصولوں کا ابلاغ نہیں کر سکے ہوں گے۔"(٦)

ہندی یا ہندوی ایک وسیع المعنی لفظ ہے جسے اس وقت کے مورخ اور تذکرہ نگار برصغیر کی ہر زبان کے لیے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ قدیم تذکرہ نگاروں نے پنجابی، گوجری، دکنی، مرہٹی وغیرہ کے لیے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صوفیہ نے اپنی تبلیغ و تلقین کے ابتدائی زمانے ہی سے فارسی میں ہندی یا ہندی میں فارسی کی آمیزش شروع کر دی تھی۔ بلکہ ہندی زبان میں کچھ نہ کچھ کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے دادا شیخ سعداللہ نے کبیر پنتھی فرقہ کے سربراہ بھگت کبیر کے متعلق جو رائے دی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ ہندی سمجھتے اور جانتے تھے۔ (٧)

صوفیہ نے مقامی زبان (یعنی دکنی اور گوجری) میں جتنا تحریری سرمایہ نظم و نثر کی صورت میں جنوبی ہند میں پیدا کیا ہے اُردو کی کسی اور قدیمی شکل میں نہیں کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ، سید بندہ نواز گیسو درازؒ، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ، شاہ امین الدینؒ اعلیٰ، شاہ برہان الدین جانمؒ، شیخ خوب محمد چشتیؒ اسی علاقے کی زبان کے مصنف ہیں۔ شاعری میں ہندی شاعری کی بحروں کو استعمال کیا ہے اس کی وجہ عوام کی عربی فارسی سے ناواقفیت تھی۔ صوفیہ نے عوام شناس زبان اور بحروں کو ترجیح دی۔ مسلمان صوفیہ نے اپنی مجالس سماع میں ہندی موسیقی یعنی ہندی راگ راگنیوں کو رائج کیا اور اپنی تبلیغی نظموں اور تلقینی شاعری میں بھی انھیں جگہ دی۔

صوفیہ نے ہندی موسیقی کی بحروں اور راگنیوں کو استعمال کیا تو اس سے ہندوی

Marfat.com

(قدیم اُردو) کے رواج پانے میں بڑی مدد ملی۔ انھوں نے دوہے کو بہت اہمیت دی۔ اس دوہے نے پنجابی میں سی حرفی اور کافی کی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ دوہے کے علاوہ صوفیہ نے جکری، خیال، قول، ترانہ اور کبت کی طرف بھی توجہ دی۔

اب ہم اُردوئے قدیم کی طرف متوجہ ہونے والے صوفیہ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اُردوئے قدیم کا ایک لفظ، ایک جملہ یا ایک بیت بھی کہی ہے یا جن کی نظم ونثر میں باقاعدہ تحریریں موجود ہیں۔ ان صوفیہ نے اُردو کی ترویج میں حصہ لیا ہے یہ اُردو کے معمار ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ برِصغیر پاک وہند میں تصوُّف کے سلسلۂ چشتیہ کے موسسِ اعلیٰ ہیں۔ ان کے ہندی کلام کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ان کے کلام کا نمونہ نہ ملے البتہ قدیم کتب کے حوالے سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ انھوں نے تقریباً پانچ سال تک ملتان میں قیام کیا اور اس دوران مقامی زبان بھی سیکھی (۸) جو اجمیر پہنچنے پر کام آئی کیوں کہ وہاں کے لوگ عربی فارسی سے ناواقف اور غیر مسلم تھے۔ ملک محمد جائسی کی تصنیف اکھروتی کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ خیال نہ کریں کہ اولیاء اللہ نے عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں کلام نہیں کیا کیونکہ تمام اولیاء اللہ ملک عرب سے خاص نہ تھے، پس جس ملک میں یہ گئے اس ملک کی زبان کو کام میں لائے اور گمان نہ کریں کہ کسی ولی نے ہندی زبان میں بات نہیں کی کیوں کہ جملہ اولیاء اللہ میں سے اوّل قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحقؒ نے اس زبان میں سخن فرمایا۔ اکھروتی کے فاضل شارح کے اس بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ہندی زبان میں تبلیغ وتلقین ضرور کی ہے (۹) ان کے تبلیغی اور رابطہ عوام کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مقامی زبان ضرور استعمال کی ہوگی۔ اس مقامی زبان کو مؤرخین وتذکرہ نگاروں نے ہندی (ہندوی) کہا ہے۔ (۱۰)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''افسوس کہ باوجود تلاش کے ہمیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا کوئی معتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملا لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے کیوں کہ ہندو

Marfat.com

بھی مسلمانوں سے کم ان کے معتقد نہیں۔''(۱۱)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۵۰۵ھ تا ۶۳۳ھ) خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ اور بڑے زبردست ولی تھے۔ آپ اوش سے سمرقند، بغداد اور اجمیر ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ دہلی کی زبان اس وقت برج بھاشا، راجستھانی، پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی کے عناصر لیے ہوئے تھی کیوں کہ یہ شہر ان زبانوں کے مقامِ اتصال پر واقع تھا۔ اس زبان میں جب فارسی اور عربی کی تھوڑی بہت آمیزش شروع ہوئی اور اس نے ایک نئی شکل اختیار کی تو امیر خسروؒ نے اسے دہلوی کہا۔ اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرح خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی مقامی زبان سے یقیناً روشناس ہوں گے کیوں کہ اس کے بغیر اس وقت کی مقامی آبادی میں تبلیغ وتلقین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (۱۲)

ایک دفعہ باوا فرید گنج شکرؒ اپنے پیرومرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ نے آنکھ جو اوپر کی تو مرید کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی۔ جب پیر نے مرید سے وجہ پوچھی تو مرید نے جواب دیا، ''آنکھ آئی ہے''۔ یہ واقعہ مولانا مبارک المعروف بہ میر خورد نے سیر الاولیاء میں لکھا ہے جس سے باواؒ صاحب کے ساتھ ساتھ خواجہ بختیار کاکیؒ کی ہندی دانی اور ہندی فہمی کا پتا چلتا ہے۔ اگرچہ بقول الف۔د۔ نسیم ہم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خواجہ بزرگ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی طرح قدیم اُردو کے الفاظ، جملے اور ابیات پیش کرنے سے قاصر ہیں لیکن ان کی ہندی دانی اور ہندی گوئی سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے ملفوظات جو مجموعہ ہشت بہشت میں موجود ہیں اگرچہ فارسی میں ہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ ان میں سے بعض ملفوظات اہلِ مجلس کے لیے ہندی زبان میں کہے گئے ہوں لیکن اس وقت کی علمی زبان فارسی کے پیشِ نظر مرتب نے ان کو ہندی سے فارسی میں ڈھال دیا ہو۔ (۱۳)

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید ہوئے اور رشد وہدایت کے لیے اجودھن (پاک پتن) کو مرکز بنایا اور یہیں فوت ہوئے۔ خواجہ فریدالدینؒ گنج شکر کے حالات وملفوظات پر لکھی جانے والی بعض قدیم کتابوں میں ان کے ہندی اقوال وملفوظات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مولانا سید مبارک میر خورد کی کتاب سیر الاولیاء باوا فریدؒ

Marfat.com

کے اقوال و ملفوظات پر مشتمل ہے اس میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ باوا صاحب کے ایک مرید شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا انتقال ہوا تو شیخ ہانسوی کی خادمہ جو مادر مومناں کہلاتی تھیں شیخ کے خورد سال فرزند برہان الدین صوفیؒ کو لے کر باوا صاحبؒ کی خدمت میں گئیں۔ باوا صاحبؒ نے ان کی بڑی عزت کی اور انھیں اپنی بیعت سے مشرف کیا اور نصیحت کی کہ کچھ وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں بھی گزارا کرو۔ اس پر مادرِ مومناں نے ہندی زبان میں عرض کیا ''خوجا بالا ہے''(۱۴) یعنی خواجہ ابھی بچہ ہے۔ اس پر شیخ فریدؒ نے بھی ہندی زبان میں جواب دیا کہ ''پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے''(۱۵) مطلب یہ کہ چودھویں کا چاند بھی پہلی رات کو چھوٹا ہی ہوتا ہے اور بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔

اس قسم کے جملے مولانا محمد علی اصغر چشتی کی مشہور تصنیف جواہر فریدی میں بھی ملتے ہیں۔ اسرارالاولیاء کے مطابق شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اپنے ایک دوست کو بھیا کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ہندی کا لفظ ہے۔ سید برہان الدین المعروف بہ قطبِ عالمؒ کے ملفوظات ''جمعات شاہی'' میں بھی باوا فرید گنج شکرؒ کا ایک منظوم قول دیا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ہندوی باتوں، اقوال، جملوں یا الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ باوا فریدؒ ہندی زبان جانتے تھے اور استعمال بھی کرتے تھے اور نظم کہنے کی طرف بھی رجحان رکھتے تھے۔ سخاوت مرزا نے قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض کے حوالے سے باوا فریدؒ کے منظوم ہندی اوراد کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱۶) منظوم ورد قدیم ریختہ کی طرز میں فارسی ہندی الفاظ کی آمیزش لیے ہوئے جملوں میں ہے۔ مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی نے ایک ریختہ بھی مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جھولنا شیخ فرید گنج شکر کے نام سے ایک طویل نظم کا بھی ذکر کیا ہے۔ حامد حسن قادری نے اپنی کتاب ''داستان تاریخ اُردو'' میں بابا فریدؒ کے ایک خاص عمل کا ذکر کیا ہے جو قدیم طرز کی اُردو میں ہے۔ بابا فریدؒ پہلے شخص ہیں جن کا ہندوی اور ریختہ کلام دستیاب ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شیخ حمیدالدین صوفی ناگوریؒ (۵۷۰ تا ۶۷۳ھ) کے فارسی مکتوبات میں ہندوی جملوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان قدیم بزرگوں کے گھروں اور گفتگو میں ہندوی (قدیم اُردو) کا تھوڑا بہت رواج ضرور تھا۔ خواجہ علی احمد صابر کلیر شریفی بھی ہندوی

Marfat.com

سے آشنا تھے۔شیخ صوفی بدھنیؒ (۷۰۴ھ) اپنی عام گفتگو میں ہندوی استعمال کرتے تھے۔ بدھنی کا لفظ بھی ان کے نام کا جُز ہونے کے اعتبار سے ان کی ہندوی سے رغبت اور تعلق کا صاف پتا دیتا ہے۔(۱۷)

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ (۶۵۲ھ تا ۷۲۴ھ) قلندرانہ شان کے صاحبِ جلال اور صاحب اثر بزرگ تھے۔مولوی عبدالحق نے فرہنگِ آصفیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں جس زبان کا رواج تھا اس کی کیفیت اس دوہے سے معلوم ہوسکتی ہے جو حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ کا ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے (۱۸)

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (متوفی ۷۲۵ھ) اپنے تبلیغی اور روحانی اثرات کی وجہ سے اہم اور مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ان کے خلفاء اور مریدین کی وجہ سے برصغیر میں چشتیہ سلسلہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔حضرت امیر خسروؒ اور حضرت امیر حسن سجزیؒ جنھوں نے ہندوی اور ریختہ میں شعر بھی کہے، انہی کے مرید تھے۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ خود بھی شعر کا ذوق رکھتے تھے۔فارسی عربی اور ہندوی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔فارسی کے ساتھ ہندوی شاعری کا بھی شوق تھا۔امیر خسروؒ کے ہندی زبان اور ہندی شاعری سے شغف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیر و مرشد بھی اس کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ان بزرگوں کی اس قسم کی شعوری اور لاشعوری کوششوں سے برصغیر میں اُردو کی قدیم شکل کے عام ہونے میں بڑی مدد ملی۔(۱۹)

حضرت امیر خسروؒ (متوفی ۷۲۵ھ) کی زبان دانی کا اعتراف ایران کے نقادوں اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔فارسی کے علاوہ امیر خسروؒ سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے۔قدیم ریختہ میں بھی جس کی شکل ہندی اور فارسی الفاظ اور مصرعوں کی آمیزش اور پیوندکاری سے ہوئی ہے، ان کا متفرق کلام ملتا ہے۔امیر خسروؒ کے ریختہ میں جہاں ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی یا نصف مصرع فارسی اور نصف ہندی کا ملتا ہے، ایسا ریختہ بھی نظر آتا ہے جس میں صرف ایک دو ہندی الفاظ پورے فارسی بند کے آخری مصرع میں موجود ہیں۔ریختہ کے علاوہ امیر خسروؒ کے

Marfat.com

بھاشا میں بھی شعر موجود ہیں۔ اپنے زمانے کی بھاشا کو امیر خسروؒ دیباچہ غرۃ الکمال میں ہندی (ہندوی) کہتے ہیں۔

ریختہ کی ایک مشہور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

امیر خسروؒ نے مختلف اصنافِ سخن میں اشعار کہے ہیں جن کو دیکھ کر اُن کی قوتِ اختراع کا اندازہ ہوتا ہے اور بقول الف۔د۔نسیم یہ پتا چل جاتا ہے کہ اس دور میں اُردو زبان و ادب کی ابتدائی شکلوں نے کیا کیا رُخ اختیار کیا تھا اور امیر خسروؒ کی وجہ سے اس میں کیا کیا اختراعات ہوئی تھیں اور ان کی کتنی تشہیر ہو چکی تھی۔ (۲۰)

خواجہ برہان الدین غریبؒ (متوفی ۷۴۱ھ) حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے خلیفہ تھے۔ وطن ہانسی تھا لیکن وہ کسبِ فیضِ روحانی اور حصولِ علومِ شرعی و دینی کے لیے دہلی آ گئے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے جب دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تو حضرت برہان الدین غریبؒ بھی بہت سے دوسرے درویشوں کے ساتھ دولت آباد آ گئے۔ حضرت امیر حسن سجزیؒ بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت برہان الدین غریبؒ اور ان کے حلقہ کے مشائخ نے تبلیغِ دین اور اصلاح احوال قلب و معاشرہ کا کام جاری رکھا جس سے جنوبی ہند کے بے شمار لوگوں کو دینی اور روحانی فائدہ پہنچا۔ (۲۱)

شیخ برہان الدین غریبؒ عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ مقامی زبان سے بھی آشنا تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''شمائل الاتقیاء'' کا ہندی میں ترجمہ ایک بزرگ میراں یعقوب سے کروایا۔

Marfat.com

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شیخ برہان الدین غریبؒ نے خود میراں یعقوب کو ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا تھا جس سے ان کی ہندی سے رغبت کا پتا چلتا ہے چاہے یہ تبلیغی تقاضے کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔''(۲۲)

''شمائل الاتقیاء'' گولکنڈے کے قدیم نثری کارناموں میں ایک خاص امتیاز کی حامل ہے۔متصوفانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''شمائل الاتقیاء'' اگرچہ ''سب رس'' سے صرف ۳۳ سال بعد لکھی گئی ہے لیکن اس کی زبان بہت صاف اور مقابلتاً جدید معلوم ہوتی ہے۔میراں یعقوب کی عبارتیں جدید نثر سے بہت قریب نظر آتی ہیں اور اس سے پتا چلتا ہے کہ زبان کتنی تیزی کے ساتھ نشوونما کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ .....میراں یعقوب نے بہت سے قدیم الفاظ ترک کر کے ان کی جگہ جدید لفظ استعمال کیے ہیں۔.....''شمائل الاتقیاء'' کی زبان قدیم اور جدید نثر کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے۔''(۲۳)

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے والد سید محمد یوسفؒ عرفِ عام میں راجا یا سید راجا کے نام سے مشہور تھے۔وہ ریختہ گو شاعر تھے۔ہندوی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے حالات میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ دینی اور عرفانی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کا دھیان مقامی زبان میں تبلیغ و تلقین کے لیے تحریریں تخلیق کرنے کی طرف بھی تھا۔جنوبی ہند میں دولت آباد علماء و مشائخ کا گہوارہ تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ (متوفی ۷۹۵ھ) جنوبی ہند کے اولیائے کرام میں سے تھے۔انھوں نے دکنی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے ہیں۔شمس اللہ قادریؒ نے ''اُردوے قدیم'' میں انھیں دکن کا سب سے پہلا اُردو مصنف کہا ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز ؒ کو اُردو کا پہلا مصنف کہا ہے۔لیکن زمانے کے اعتبار سے شیخ

Marfat.com

عین الدین گنج العلمؒ کو اوّلیت دینی پڑتی ہے کیوں کہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا عرصہ عمر ۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ ہے اور شیخ عین الدین گنج العلمؒ کا ۱۳۰۶ سے ۱۳۹۳/۱۳۹۶ تک۔ (۲۴)

ہندی یا ہندوی اُردو کی قدیم شکل ہے۔ پرانے تذکرہ نگاروں نے پنجابی، دکنی، گوجری اور دیگر کئی علاقائی زبانوں کے لیے یہی لفظ ہندی استعمال کیا ہے یہاں تک کہ اہلِ اُردو بھی اپنی زبان کو ہندی کہتے رہے ہیں۔ سید محمد عبداللہ حسینیؒ صاحبِ تصنیف بزرگ ہیں اور انھوں نے سید عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب ''نشاط العشق'' کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ سید محمد عبداللہ حسینی کا تعلق بہمنیہ دور سے ہے جس وقت دکنی زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور سید محمد عبداللہ حسینیؒ اس دور کے تین ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے دکنی زبان میں مذہب اور تصوُّف کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بقول الف۔ د۔ نسیم ان لوگوں کی علمی اور روحانی حیثیت کے علاوہ تاریخ لسانیات میں بھی اہمیت ہے۔ یہ بزرگ اُردوئے قدیم کے نقیب ہیں۔ (۲۵)

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے علمی اور روحانی مرتبہ کا اندازہ ان کے مریدوں، خلفاء اور اُن کی تصانیف کے متنوع موضوعات سے ہوسکتا ہے۔ تصوُّف کے موضوع پر ان کی تقریباً تیس کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں اور باقی عربی اور دکنی میں۔ مؤلف ''روضتہ الاولیاء'' نے لکھا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نماز ظہر کے بعد مریدوں کو علمِ تصوُّف اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور جو لوگ عربی فارسی سے ناواقف تھے ان کے لیے دکنی زبان میں تقریر فرمایا کرتے تھے۔ (۲۶) مریدوں کی فرمایش پر انھوں نے دکنی نثر میں چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے ہیں۔ رسائل کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) معراج العاشقین ۲) ہدایت نامہ ۳) عشق نامہ
۴) تلاوت الوجود ۵) درالاسرار ۶) شکار نامہ
۷) تمثیل نامہ ۸) ہشت مسائل ۹) سہ بارہ

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ شاعر بھی تھے۔ ان کی زیادہ تر ہندی (دکنی) شاعری موسیقی یعنی راگ راگنیوں کے تابع ہے۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں اور ہندی سماع اور موسیقی

Marfat.com

کو غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک ہندی کی چیزیں نرم، لوچ دار اور دل میں رقت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں اور اس کا راگ بھی نرم ہوتا ہے اور طبیعت میں عاجزی پیدا کرتا ہے۔ (۲۷)

سید اکبر حسینیؒ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے فرزند تھے۔ انھیں دکنی نظم و نثر دونوں سے دلچسپی تھی۔ مولوی محمد یافعی نے ان کے ارشادات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جو نظم و نثر کے ملے جلے انداز میں ہے اور زبان تقریباً وہی ہے جسے جملہ اولیائے دکن نے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نثر پارہ کو دیکھیے:

''سنو اے مسلمانو، طالب خدا کے بوجھو، زندگی سہل ہے۔ جیون کا بھروسا نہیں۔'' (۲۸)

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ (متوفی ۹۰۳ھ) مکے میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان آ کر بیجاپور میں قیام کیا۔ اپنے زمانے کے اولیائے کبار میں سے ہوئے ہیں۔ خواجہ کمال الدین بیابانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ تصوُّف کے موضوع پر انھوں نے چھوٹے بڑے کئی رسالے لکھے ہیں۔ زبان ان سب رسالوں کی دکنی ہے۔ شاہ میراں جیؒ نے بیجاپور میں بقول مولوی عبدالحق:

''ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق ہوئے اور انھوں نے اسی (ہندی) کو اپنی زبان سمجھا اور اس زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اس خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ ہوا اور وہاں ایسے ایسے خوش بیاں اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اُردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔'' (۲۹)

تصوُّف کے مسائل کو ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی، ان کے لیے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر پر نہ جانا

Marfat.com

چاہیے باطن کو دیکھنا چاہیے..... گھورے پر بارش ہوئی اور وہاں کسی کو چمکتا ہیرا مل گیا۔ یہ زبان گویا گھورے کا ہیرا ہے، کوئی معقول آدمی ایسے ہیرے کو گندہ سمجھ کر پھینک نہیں دے گا۔''(۳۰)

شاہ میراں جیؒ کے تصوُف کے موضوع پر قابلِ ذکر رسالے شرحِ مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس ہیں۔ نثر کے علاوہ ان کے رسالے دکنی نظم میں بھی ہیں۔ ان میں ایک کا نام شہادت الحقیقت ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے لیکن زبان سلیس اور سادہ ہے۔ دوسرا منظوم رسالہ خوش نامہ ہے۔ خوش نغز بھی اُنہی کا رسالہ ہے۔

میراں جی شمسؒ العشاق نے ہندی زبان فیضانِ نبویؐ سے سیکھی۔ میراں جی کا ہندی زبان کو ایک بشارت کے تحت اختیار کرنے کا واقعہ مولوی عبدالحق نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''کیا یہ کچھ کم کرامات ہے کہ ایک شخص جو مکے میں پیدا ہوتا ہے ہند میں آ کر یہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی میں لکھتا پڑھتا اور اسی میں نغمہ سرا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ خود اپنے حال میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ مکے سے مدینہ شریف کی زیارت کو گئے اور تقریباً بارہ سال روضۂ مبارک کے قریب رہے۔ ایک شب جمعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں ہندوستان جانے کے لیے ارشاد فرمایا تو آپ نے نہایت عجز سے یہ عذر کیا کہ میں ہندوستان کی زبان سے ناواقف ہوں۔ آنحضرتؐ نے زبان مبارک سے فرمایا ''ہمہ زبان بشما معلوم خواہد شد'' اور یہی ہوا۔ ان کا تقریباً سارا کلام اسی ہندی زبان میں ہے۔ اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت ہندوستان کی عام زبان یہی تھی۔''(۳۱)

شاہ برہان الدین جانمؒ (متوفی ۹۹۰ھ تقریباً) میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ شاہ برہان الدینؒ نے اپنے والد میراں جی کی طرح ہندی میں لکھنے کی معذرت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے زمانے میں عالم اور ثقہ لوگ ہندی میں لکھنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظاہر پر نہ جاؤ اور باطن کو دیکھو۔ لفظوں کو نہ دیکھو اور معنی پر خیال کرو۔ ہندی لفظوں میں کوئی عیب اور خرابی نہیں۔ اگر سمندر کے موتی کسی ڈبرے یا جوہر میں ملیں تو عقلمند آدمی

Marfat.com

انھیں کیوں نہ لے۔فرماتے ہیں:

''عیب نراکھیں ہندی بول''(۳۲)

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم لکھتے ہیں:

''اس ہندی اختیاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین اور معرفت کی باتیں ان لوگوں تک بھی پہنچ گئیں جو عربی فارسی سے نابلد تھے اور ساتھ ساتھ ایک نئی زبان (جو اس وقت ہندی اور بعد میں اُردو کے نام سے منسوب ہوئی) کی ترویج وترقی میں بھی مدد ملی۔''(۳۳)

ڈاکٹر سیدہ جعفر، برہان الدین جانمؒ کو دکن کا پہلا مصنف مانتے ہوئے لکھتی ہیں:

''وہی دکن کے پہلے مصنف تھے''(۳۴)

شاہ برہان الدینؒ جانم کے نثری رسالے کا نام ''بحرالحقائق'' ہے۔اس کی زبان دکنی ہے اور مضامین عارفانہ ہیں۔ یہ بھی سوال و جواب کی طرز میں ہے۔سوال و جواب کا جو انداز میراں جی شمس العشاق نے منظوم رسالوں میں اختیار کیا وہی انداز یہاں نثر میں ملتا ہے۔ یہ انداز مسائل کی تفہیم کا مؤثر اور عمدہ انداز ہے۔ان کا دوسرا رسالہ نثر میں ''کلمتہ الحقایق'' ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ ''کلمتہ الحقایق'' دبستان بیجاپور کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے مصنف کے بارے میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں۔ یہ ہماری قدیم ترین نثر کا ایک مستند نمونہ ہے۔ عام طور پر مرید خدا، وجود، انسانی ذات وصفات اور دوسرے مختلف متصوفانہ مسائل سے متعلق جن سوالوں کے جوابات جاننا چاہتے ہیں، انھیں جانم نے ''کلمتہ الحقایق'' میں سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالہ اُس دور کے دوسرے رسالوں کی نسبت ضخیم ہے اور اس کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں کوئی اہم اختلافِ نسخ نظر نہیں آتا۔ جانم نے اپنی زبان کو ''گجری'' سے تعبیر کیا ہے اور سنسکرت کے تت سم اور رتت سبھو الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔ ''کلمتہ الحقایق'' میں حسبِ ضرورت فارسی نثر سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف اپنے مطلب کو دکنی نثر کا جامہ پہنانے پر زیادہ قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ فارسی نثر کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دکنی

Marfat.com

عبارتیں لکھتے لکھتے فارسی جملے تحریر کرنے لگتا ہے۔عبارتیں کہیں کہیں نا قابلِ فہم اور گنجلک بھی ہو گئی ہیں۔غیر مربوط جملوں میں تسلسل بیان کے فقدان کا احساس ہوتا ہے۔غالباً نثر کی اوّلین کاوش ہونے کی وجہ سے بھی یہ سقم پیدا ہوا ہے۔جانم نے مکالمے کے انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے عہد کی عام فہم اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ان کے بعض جملے خوبصورت اور دل نشین معلوم ہوتے ہیں۔عبارت کے درمیان اشعار اور دوہے بھی نقل کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں مقفیٰ جملے بھی موجود ہیں۔بعض جگہ طالب کا سوال اور مرشد کا جواب دونوں نظم میں ہیں۔برہان الدین جانم کی نثر میں ترسیل کی بعض کوتاہیوں کے باوجود انشاء کے محاسن کی جھلک کہیں کہیں ضرور نظر آتی ہے۔یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مصنف کے سامنے نثر کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں تھا جو اس کی رہبری کر سکتا۔ (۳۵)

شاہ برہان الدینؒ جانم کا زیادہ تر سرمایہ نظم میں ہے۔محی الدین قادری زور نے اپنی تالیف اُردو شہ پارے میں ان سب کا تعارف کرایا ہے۔اُنھوں نے غزلیں اور دوہے بھی لکھے ہیں۔مثنوی اور خیال بھی لکھے ہیں۔بقول مولوی عبدالحق ''شاہ برہان کا کلام اگرچہ سادہ ہے لیکن بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے۔''(۳۶)

دکن کے صوفیہ میں امین الدین اعلیٰؒ کی شخصیت ایک امتیازی شان کی حامل نظر آتی ہے۔امین الدین اعلیٰؒ، برہان الدین جانمؒ کے فرزند اور شمس العشاق شاہ میراںؒ جی کے پوتے تھے۔وہ باپ دادا کے قدم بقدم چلتے ہیں۔وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی۔

شاہ امینؒ اور اُن کے مریدوں نے نظم و نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ایک ایسی زبان جو ''گھر بھا کا'' کہلاتی تھی، رشد و ہدایت کا مؤثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر و فن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔امین الدین اعلیٰؒ نے نثر میں بہت سے رسالے سپردِ قلم کیے۔''گنج مخفی''، ''رسالہ وجودیہ''، ''گفتارِ امین الدینؒ''، ''ظاہر و باطن''، ''عشق نامہ''، ''شرح کلمہ طیب'' اور ''کلمتہ الاسرار'' میں انھوں نے اپنی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔''گنج مخفی'' میں وجود کے مراتب اور تنزلات کی مفصل شرح کی گئی ہے اور اس رسالے کی نثر مربوط و مرتب ہے اور بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر:

Marfat.com

''زبان کی قدامت کے باوجود کہیں اشکال پیدا نہیں ہوتا ایک ایسے دور میں جبکہ زبان ابھی عالمِ طفولیت میں تھی اور اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی اتنی اصطلاحات وضع کرنا اور اُنھیں عوام کے لیے قابلِ قبول بنا کے پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ شاہ امین الدین کی عبارتیں سلجھی ہوئی اور ان کے فقرے برجستہ ہیں۔''(۳۷)

''رسالہ وجودیہ'' میں مصنف نے اپنے مخصوص تصوُّف یعنی پانچ عناصر پچیس گن سے بحث کی ہے۔ ان کے بیانات میں استعارے بھی موجود ہیں۔ ''گفتارِ امین الدین'' میں زیرِ بحث مسائل کی تائید میں استدلال سے اپنی بات میں زورِ بیان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ ظاہر و باطن کی عبارتوں میں روانی نظر آتی ہے۔ ''کلمتہ الاسرار'' میں دوسرے رسالوں کی نسبت زیادہ ادبیت ہے اور یہ رسالہ شاہ امین کا سب سے طویل نثری کارنامہ ہے۔

شاہ امین کی عبارتوں میں ربط بھی ہے اور روانی و سلاست بھی۔ تسلسل کی کمی نہیں اور مفہوم کی وضاحت میں تشبیہات و استعارات کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''برہان الدینؒ جانم کی زبان پر ''دیسی الفاظ'' کا غلبہ تھا لیکن شاہ امین کی تحریریں عربی اور فارسی سے اثر پذیری کی غماز ہیں۔ انھوں نے فارسی اضافتوں اور ترکیبوں سے بھی کام لیا ہے۔ اپنے رسائل میں وہ دکنی نثر کے درمیان فارسی جملے لکھتے جاتے ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایات کو آگے بڑھایا اور اُردو نثر کو اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جہاں اس کے منفرد خدوخال ابھر سکے اور اس کا مخصوص مزاج اور انفرادی آہنگ اور لب ولہجہ متعین ہو سکا۔''(۳۸)

امین الدین اعلیٰؒ نے دوہے بھی لکھے ہیں۔ ایک دوہے میں کہتے ہیں:

مرنا ہار، جیونا بسار

جیونا ہار، مرنا بسار

Marfat.com

سو وہ سریجن کی دیکھ بچار
لال سریجن دیکھن پاوے
آپس میں دیکھ آپ گنواوے
من رانی حضرت قول بھواوے (وغیرہ)

(''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام''۔ص ۵۱)

میراں جی حسن خدانما (متوفی ۱۰۷۴ھ) برصغیر پاک و ہند کے ان صوفیہ کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو عظیم روحانی اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ مرشد سے سرمایۂ علمی اور فیضِ روحانی حاصل کرنے کے بعد وہ حیدرآباد آ گئے اور یہیں بیٹھ کر خلقِ خدا کی بھلائی اور ہدایت کا کام کرتے رہے۔ میراں جی خدانما نے شیخ احمد کی تصنیف ''تمہیدات عین القضاۃ'' کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''میراں جی خدانما کا شمار ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے اُردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار قائم کیا۔ ان کی نثر عام فہم اور سلیس ہے۔ گنجلک اور پیچیدہ عبارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ کہیں کہیں قافیے سے بھی کام لیا ہے۔ خدانما کی نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مثالوں کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ مثالیں انھوں نے روزمرہ زندگی سے اخذ کی ہیں کیوں کہ ان کے مخاطب ایسے عوام تھے جن کے لیے تصوُّف کے اسرار و رموز کی تفہیم آسان نہیں تھی۔ خدانما نے ان کی عملی اور ذہنی استعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے مطالب کی سادہ زبان میں مثالوں کی مدد سے اچھی صراحت کی ہے۔''(۳۹)

جنوبی ہند کے صوفیہ نے دکنی اور گوجری میں نثر و نظم میں کام کیا کیونکہ مقامی آبادی کی اکثریت دکنی آشنا تھی۔ صوفیہ جانتے تھے کہ جس زبان میں بھی معرفت و ہدایت کی بات سمجھی جائے

Marfat.com

وہی زبان اختیار کرنی چاہیے۔ اُردو کو یہی فضیلت حاصل ہے کہ وہ برصغیر کے کسی خطے کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی یہ اس خطے کی زبان ہے اسی لیے قدیم تذکرہ نگاروں نے ہر خطہ کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا ہے۔ برصغیر کے ہر علاقے کی زبان اُردو کے وسیع سمندر میں مدغم ہے۔

پروفیسر ابراہیم ڈار نے لکھا ہے (۴۰) کہ ایک دفعہ حضرت شاہ عالمؒ نے محمود بیکڑہ کو کہا تھا ''پڑھ ڈو کرے'' (یعنی پڑھ اے بیٹے) شاہ عالم کے اس طرز کے اور جملے بھی ملتے ہیں جن سے ہم ان کی قدیم اُردو سے آشنائی جان سکتے ہیں۔

شیخ بہاالدین باجنؒ (متوفی ۹۱۲ھ) فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باجنؒ ان کا تخلص تھا جس کے معنی ساز ہیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم لکھتے ہیں:

> ''اس تخلص سے اس بات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے کہ شیخ بعض دوسرے قدیم بزرگانِ چشت کی طرح اپنی شاعری کو بھی راگ راگنیوں کے تابع رکھنا چاہتے تھے اس لیے کہ شعر میں کشش، وقت اور موسم کی نسبت سے اسے کسی سُر تال کے تابع کرنے سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فارمولے سے صوفیائے چشت ہندوؤں کو مندر کی فضا سے نکال کر محفلِ سماع میں لائے ہیں اور اپنے دوہوں، شبدوں اور اشلوکوں کے ذریعے ان کو توحید کی وہ مے پلائی ہے کہ مندر گریز اور مسجد آشنا ہو گئے۔ سُر جسے ہندو خدا کہتے تھے، اہرمن سے یزداں بن گیا۔'' (۴۱)

شیخ باجنؒ ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجنؒ بقول محمود شیرانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو ''زبانِ دہلوی'' کے نام سے یاد کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اِن ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ (۴۲)

شیخ باجنؒ کی کتاب ''خزانۂ رحمت'' کے آخری باب میں ہندی دوہے اور جکریاں ہیں۔ شیخ باجنؒ کے اشعار کی زبان اتنی صاف ہے کہ بعض شعر آج کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔

قاضی محمود دریائی بیر پوریؒ (متوفی ۹۴۱ھ) گجرات کے اولیائے عظام میں سے تھے۔

Marfat.com

گجرات چوں کہ نسبتاً محفوظ علاقہ تھا اس لیے دلّی کے عوام کے ساتھ علما اور صوفیہ بھی دلّی سے ہجرت کر کے گجرات چلے گئے۔ تصوُّف اس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا۔ گجری ادب اسی استعارے سے پیدا ہوا۔ اس زمانے میں گجرات مقامی زبان میں ذریعۂ اظہار کا سب سے سرگرم مرکز بن گیا۔ گجری ادب کے ادیب نے فارسی کی جگہ گجری زبان کو ترجیح دی۔ گجرات میں فارسی زبان و ادب کی روایت گہری نہ تھی اس لیے یہاں کے صوفیہ اپنا پیغام گجری میں دے رہے تھے۔ (۴۳)

جکری صوفیانہ طرزِ اظہار اور بزرگانِ طریقت سے عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے ایک صنف تھی۔ قاضی محمود دریائی کی شہرت کا سبب ان کی لکھی ہوئی جکریاں تھیں۔ جکری کا آہنگ ہندوی رنگ سے عبارت ہے۔ محمود دریائی کی شاعری کا لب و لہجہ اور شعری لغت ان کو اس دور کی مقبول لوک روایت سے منسلک کرتی ہے۔

شاہ علی محمد جیوگام دھنیؒ (متوفی ۹۸۳ھ) باجنؒ اور محمود دریائیؒ کی روایت کے صوفی شاعر ہیں۔ زبان و اسالیب پر ہندوی روایت کا اثر ہے۔ کہیں کہیں عربی و فارسی الفاظ یا صوفیانہ اصطلاحیں ملتی ہیں جو ان کے کلام کو گجری اُردو کہنے کا واحد جواز بنتی ہیں۔ بہ صورتِ دیگر ان کے کلام کو حقیقتاً ہندی کہنے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ چوں کہ یہ سب شعرا ایک خاص مقصد کے لیے ادب تخلیق کر رہے تھے لہٰذا وہ زبان کا وہی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو لوگوں میں مقبول تھا اور قابلِ فہم بھی، اسی لیے عربی فارسی الفاظ کی اصل صورتوں کو پیش کرنے سے بھی کہیں کہیں گریز کیا گیا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہے وہاں مقامی اثرات کے غلبہ کے سبب ان الفاظ کو ہندی بنا لیا گیا ہے جس سے ابلاغ کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ بعض منزلوں پر ان کا لسانی اسلوب عربی و فارسی اثرات سے بہت دور ہو جاتا ہے اور اس پر مقامی زبانوں کی چھاپ بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ (۴۴)

شاہ علی محمد کا ایک کام بہت قابلِ قدر ہے۔ ہندی اوزان کی روایت میں لکھتے لکھتے وہ فارسی اوزان کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ مقامی رنگ کی دھنوں اور نغموں کے ساتھ ساتھ ان کے فارسی کے تہذیبی آہنگ بھی اپنے رنگ دکھانے لگتے ہیں۔ یہ ایک اہم تبدیلی تھی جو مستقبل میں زبان کے وجود کو بدلنے میں معاون ثابت ہونے والی تھی۔ (۴۵)
اس تبدیلی کے متعلق شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

Marfat.com

''شاہ علی محمد ان بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے فارسی اوزان کو ہندی اوزان میں روشناس کرنے کی ابتدائی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں ہزج مربع سالم ورجز مربع سالم میں دو نظمیں موجود ہیں۔''(۴۶)

جیو گلم اعلیٰ درجہ کا جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ اُن کا لکھا ہوا ایک سراپا اسی جمالیاتی ذوق کا حامل ہے۔ ہندوی اسلوب کا یہ سراپا اس عہد کی جمالیات کا عکاس ہے۔(۴۷) اس سراپا کا شعری اظہار ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں مع ترجمہ موجود ہے۔

عسکری فتح کے بعد سیاسی اور انتظامی دباؤ موثر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تہذیبی اثر بڑھتا ہے۔ جب عسکری، سیاسی اور تہذیبی دباؤ میں ربط اور استحکام پیدا ہونے کی شکل بنتی ہے تو لسانی دباؤ کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے اور مقامی لسانی روایت پر فارسی اثر جھلکنے لگتا ہے۔ گجرات اور دکن میں بالخصوص اس نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ گجرات کی فتح ادبی تاریخ کے رخ کو بدل دیتی ہے۔ وہ زبان جسے ''گجری'' کہا جاتا تھا اور جو تقریباً ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ مقامی اثرات کے غلبہ میں رہ کر پروان چڑھی، اس کی تنہائی کا زمانہ گزرنے کا وقت آ جاتا ہے۔ شیخ باجن سے شاہ علی محمد جیو تک زبان کی جو صورت بنی تھی، وہ ہندوی اثرات کی ترجمان تھی مگر اکبر کی فتحِ گجرات سے فارسی کا نفوذ ہوتا ہے۔ مغلیہ تہذیب سرایت کرنے لگتی ہے۔(۴۸)

خوب محمد چشتی ؒ (متوفی ۱۰۲۳ھ) کی دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں: (۱) ''خوب ترنگ'' (۲) ''چھند چھنداں''۔ ''خوب ترنگ'' کے بعض حصے بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری گاڑھے طور پر ہندوی اسلوب میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اثرات کی عملی شہادت بھی ملتی ہے گویا ''خوب ترنگ'' میں زبان ہندوی بھی ہے اور اس اسلوب سے گریز کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر فارسی روایت کا دباؤ موجود ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی اور ہندوی کی شعری لغت میں تصادم کی صورت بنتی ہے۔(۴۹) اس کتاب کی لسانی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب کی زبان کو پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانوں کے درمیان ایک عبوری نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں وہی لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم پنجابی، قدیم برج، قدیم دکنی اور قدیم مرہٹی میں بھی ملتی ہیں۔ متصوفانہ موضوعات کے بیان میں فارسی ذخیرۂ لغت پہلی بار زیادہ تعداد کے ساتھ ملتا

Marfat.com

ہے۔''خوب ترنگ'' گجری ادب کی روایت میں تخلیق ہونے والے صوفیانہ ادب کی فکر انگیز کتاب ہے۔خوب محمد چشتی اس دور کا اہم تخلیقی ذہن ہے جس نے مثنوی مولانا روم کی طرز پر حکایات لکھ کر زندگی کے حقائق اور فلسفہ کو پیش کیا ہے۔

''چھند چھنداں'' سے اُردو کے تخلیقی وجود کو فارسی بحروں سے روشناس کرایا گیا اور اس کی منفرد پہچان کے وسیع مواقع فراہم کر دیے گئے۔ یہ کتاب فارسی اوزان کے تعارف کے لیے ہندوی میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صرف عروض ہندی کا ذکر ہے اور ہندی کے اوزان کی فارسی کے اوزان سے مطابقت دکھائی گئی ہے۔دوسرے حصے میں عروض کی باتیں ہیں۔اُردو ادب کی تاریخ میں اس کتاب کو ایک ہنگامہ خیز انقلاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس انقلاب کا پہلا نتیجہ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات ہے جس میں اُردو زبان اوزان و بحور، جذبات، تخیل اور تشبیہ اور محاورے میں فارسی زبان کی تابع بنا دی گئی۔''چھند چھنداں'' نے قدیم اُردو کا ادبی منظر نامہ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ کتاب ایک نئے عہد کے طلوع ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ جب فارسی اوزان اختیار کرنے کی روایت پڑی تو اوزان اپنے ساتھ فارسی کی شعری لغت، نغمگی اور طرزِ احساس کی لہر بھی لیتے آئے۔ مستقبل میں ان فارسی اوزان کی وجہ سے مقامی روایت سے بننے والے الفاظ رفتہ رفتہ زبان کے نئے مزاج سے ہم آہنگی نہ پا کر گریز پا ہونے لگے۔ (۵۰)

شیخ خوب محمد چشتیؒ کی ایک کتاب بھاو بھید بھی ہے جو شاعری کی صنعتوں کا ذکر کرتی ہے۔صنائع کی بنیادی تعریف وتشریح فارسی میں ہے لیکن ساتھ ہی گوجری زبان میں مفہوم ادا کر دیا گیا ہے۔علم صنائع سے شعر میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ بھاو بھید اور چھند چھنداں دونوں نے فارسی بحروں کو ہندی میں مقبول بنانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر ابراہیم ڈار کہتے ہیں (۵۱) کہ اس انقلاب انگیز تغیر نے اُردو کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا جس کے مطابق فارسی بحروں اور خیالات کو ہندی میں منتقل کیا گیا۔محمد قلی قطب شاہ کی قدیم اُردو (دکنی) شاعری میں اس کا اثر نظر آتا ہے۔ یہی اثر ولی اورنگ آبادی سے ہوتا ہوا شمالی ہند کی اردوئے معلیٰ تک پہنچا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ہر زبان کا ایک تہذیبی باطن ہوتا ہے اور یہ تہذیبی باطن زبان کی شناخت

Marfat.com

بن جاتا ہے۔ اُردو کے تہذیبی باطن میں ایک طرف برصغیر کا مقامی وجود اور دوسری طرف عرب وعجم اور وسط ایشیائی وجود کا تشخص موجود ہے۔ وہ زبان جسے ہم اُردو کہتے ہیں، اس کا تہذیبی باطن ان ہی عناصر سے مرتب ہوتا ہے۔ گجراتی ادب ہو یا دکنی ادب، ان ادبیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس تہذیبی باطن پر برابر نظر رکھتے ہیں۔''(۵۲)

شمالی ہند میں صوفیہ فارسی زبان میں شعر کہتے اور اقوال درج کرتے رہے مگر گجرات میں مقامی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا۔ گجرات کے صوفیہ اپنا پیغام گجری میں دے رہے تھے۔ گجری ادب میں گجری زبان کو ترجیح دینے کی وجہ یہ تھی کہ گجرات میں فارسی زبان وادب کی روایت گہری نہ تھی۔ ان لوگوں نے زبان کا ایسا ڈھانچا بنالیا تھا جو عام لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا۔ اس دور کی گجری زبان پر مقامی روایت کا غلبہ گہرا تھا اور بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری یہ غلبہ فکری اور لسانی سطح پر آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔(۵۳) گجری ادب میں گجری کو بولی کی سطح سے اُٹھا کر ادبی شکل دینے والے صوفیا شیخ باجنؒ، خوب محمد چشتیؒ، علی محمد جیوگام دھنیؒ اور قاضی محمود دریائیؒ تھے۔ ان لوگوں نے زبان کی صلاحیت اور توانائی میں اضافہ کیا۔ شیخ باجنؒ کی زبان پر برج بھاشا اور ہندی کی روایت کا گہرا اثر ہے۔ زبان کی قدیم شکلیں اُن کی شاعری کے وجود کو مقامی روایت سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ مقامی اصناف اور بحروں کا استعمال ان اصناف سے وابستہ روایات کو بھی ان کے کلام میں ظاہر کرتی ہیں۔ اصناف اختیار کرنے کا مطلب کسی زبان کے طرزِ احساس اور اس کے تخلیقی سانچوں کو اختیار کرنا ہے۔ باجنؒ کے لکھے ہوئے دوہرے ہندی طرزِ احساس کی عام صداقتوں اور تجربات کے مظہر ہیں۔ ان کے پیچھے ہندوستانی روایت کا صدیوں پرانا تجربہ اور دانش موجود ہے۔(۵۴)

اس دور کے صوفیہ زبان کے عوامی پیکر تراشتے ہیں اور اس لسانی پیکر میں ہدایت اور نصیحت کرتے ہیں۔ اُن کی زبان کو ممتاز کرنے والی شے اسلام کی حقانیت کے تصورات تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اس بات کی تائید میں لکھا ہے:

''ان ایام میں اُردو زبان کے امتیازی خط وخال جو دوسری زبانوں سے

Marfat.com

اسے ممیّز کر سکیں، صرف معدودے چند ہیں یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمانی جذبات و خیالات ہوں۔ اس میں ایک حد تک عربی و فارسی کا عنصر موجود ہو۔''(۵۵)

لسانی اعتبار سے باجنؔ کی کتاب ''خزائنِ رحمت'' قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یہ اُردو کے قدیم ترین روپ کا مستند نمونہ بھی ہے اور اُردو میں غنائیہ شاعری کی روایت کو پروان بھی چڑھاتی ہے۔

اس دور کے صوفیہ صوفیانہ طرزِ اظہار کی صنف جکری کو استعمال کرتے ہیں۔ قاضی محمود دریائی کی شہرت کا سبب ان کی لکھی ہوئی جکریاں ہیں۔ جکری نظام الدین اولیا کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ قاضی محمود دریائی نامور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو بیر پور گجرات میں آباد تھا۔

صوفیہ کے ساتھ محبت و عقیدت بہمنی سلاطین کی موروثی روایت بن گئی تھی۔ دکن کی تاریخ میں بہمنی دور کو ''امتزاج'' کا دور کہا جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے امتزاج سے دکن میں قدیم اُردو کی لسانی تشکیل ہو رہی تھی۔ بہمنی سلطنت دکن میں اُردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھی اور حضرت خواجہ گیسو دراز اور شاہ میراں جی شمس العشاق جیسے صوفیہ کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ بہمنی ریاست میں ایسے صوفی شعرا ہیں جنھوں نے دکن کی سرزمین پر اُردو غزل کے رنگ روپ کو تشکیل دیا۔ دکنی ادب کے ابتدائی دور میں زبان کا ایک منصب صوفیانہ تصورات کا اظہار تھا اس لیے اس دور کی کاوشوں کو ''صوفیانہ ادب'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل قدر و قیمت اور اہمیت لسانی اور تاریخی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور دوسرے صوفیہ کی تحریریں صوفیانہ ادب کے زمرے میں آتی ہیں اور اُن کا جائزہ ان کے اپنے عہد کے لسانی پس منظر میں رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ دوہے کا استعمال اور اس سے دلچسپی کی وجہ دوہے میں اخلاقیات اور سوز و گداز کی موجودگی تھی اور یہی کیفیت صوفیانہ طرزِ احساس میں بھی موجود تھی۔

قدیم اُردو کے سلسلے میں دکن میں حضرت میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے جانشینوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں اس لیے اُردو کے صوفیانہ ادب میں ان کا ممتاز مقام ہے۔ برہان الدین جانم کے خاندان کی لسانی اور صوفیانہ خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا

Marfat.com

سکتا۔ دکن میں قدیم اُردو کی اشاعت کا سلسلہ مقامی صوفیہ کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ صوفیہ کی خانقاہوں اور درگاہوں میں صوفیانہ ادب تسلسل کے ساتھ تخلیق ہوتا رہا۔ انھوں نے قدیم اُردو کو رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا۔ جانؔم کی شاعری میں لسانی شعور کے ساتھ فکری سطح بھی موجود ہے۔ جانؔم کے والد حضرت شمس العشاق کے ہاں ابلاغ کا مسئلہ کم دشواری پیدا کرتا ہے اور بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''فارسی کی شعری لغت کی آمیزش سے ان کا اسلوب کافی حد تک عام فہم زبان کے معیارات تک جا پہنچتا ہے''۔ (۵۶) انھوں نے مقامی شعری لغت کی روایت سے اللہ کے اوصاف اور اس کی ذات کی مختلف سطحوں کو اجاگر کیا ہے اور اللہ کو مقامی لسانی روایت کے شعور میں دیکھا ہے۔ (۵۷)

بیجاپور میں فارسی شعر و ادب کا چرچا گولکنڈہ سے زیادہ رہا لیکن فارسی ادب کی روایت کے فروغ کا عمل بہت محدود رہا اور دکنی زبان پر اس کا کوئی خاص اثر مرتب نہ ہو سکا۔ بیجاپور کی لسانی روایت پر ہندوی اثرات کا غلبہ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپوری صوفیہ زبان کے ادبی اوصاف سے زیادہ زبان کے ابلاغ پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مقصد اپنی بات کو عام آدمی تک پہنچانا تھا اس لیے وہ عام فہم زبان استعمال کرتے رہے۔ بیجاپوری صوفیہ کی زبان فارسی اثرات کی صحبت سے گریز کرتی رہی جب کہ گولکنڈہ میں فارسی کے شعری اسالیب آہستہ آہستہ سرایت کرتے رہے۔ نثری اسلوب میں جانؔم کے ہاں فارسی اور ہندوی اسالیب کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے لیکن زبان کا ڈھانچا دکنی ہی رہتا ہے مگر فارسی لغت کے ملاپ سے یہاں ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو جانؔم کے شعری اسلوب کے مقابلے میں مختلف ہے۔ (۵۸)

تاریخ کے کسی دور میں لکھا گیا ادب اُس دور کی زبان اور اسالیب کی شہادت دیتا ہے اور ساتھ ہی اُس دور کی روحانی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ ہم صوفیہ کی نگارشات کو صوفیانہ ادب کے لحاظ سے بھی پڑھ سکتے ہیں اور لسانی معیارات کی جانچ پرکھ کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ غرض کہ برصغیر کے کسی علاقے کی بولی یا زبان کو لیں وہ اُردو کے وسیع سمندر میں مدغم ہے۔ قدیم دور میں بھی اور اب بھی، اس لیے یہ کہنا کہ اُردو اس علاقے کی زبان ہے اور اُس علاقے کی نہیں، محض ایک ضد ہے۔ یہ ہر علاقے کی زبان ہے۔ بقول ڈاکٹر الف۔د۔ نسیم ۔ برصغیر کی

Marfat.com

''پدری زبان'' ہے۔ مادری زبان کچھ بھی ہو، اس کو ہر کوئی سمجھتا بوجھتا اور بولتا چالتا ہے۔ ہمارے صوفیہ نے اسی لیے اسے استعمال کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صوفیہ اور ان کا پیغام دونوں محدود اور علاقائی ہو جاتے۔ یہ تصوُّف اور اُردو ہی کی برکت ہے کہ سرحد، پنجاب، دہلی، ہانسی، راجستھان، پانی پت، بہار اور ملتان کے صوفیہ ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں۔ ان کا پیغام مختلف رنگوں کے باوجود یک رنگ ہے۔ ان کے معتقدوں، مریدوں اور ماننے والوں میں محبت اور یگانگت ہے چاہے وہ کہیں کے کیوں نہ ہوں اور ان کی زبان چاہے کسی علاقے کی کیوں نہ ہو۔ لفظی، معنوی اور اسلوبی اعتبار سے اُردو مرکزیت پر قائم ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو مختلف اللسان اور مختلف المقام ہونے کے باوجود صدیوں جس سبب نے ایک لڑی میں پروئے رکھا وہ یہی ''صوفیا اختیاری'' تھی۔ ایک علاقے کا صوفی ہر علاقے کا صوفی ہے۔ بخلاف جدید دور کے غلط سیاسی رجحانات کے جس نے رہنماؤں کو علاقائی اور مقامی بنا دیا ہے۔ آج بھی برصغیر کے ایک علاقے کا رہنے والا دوسرے علاقے کے سیاسی رہنما اور زبان کو تو نہیں مانتا لیکن صوفی اور اس کی زبان کو مانتا ہے۔ مانتا ہی نہیں اپنے عقیدے کا جزو خیال کرتا ہے۔ (۳۹)

Marfat.com

حواشی

۱) افتخار عارف، پیش لفظ ''اُردوے قدیم اور چشتی صوفیہ'' از ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، طبع اوّل۔

۲) مولوی عبدالحق، ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام'' نئی دلّی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۰۰۱ء، ص۴۔

۳) افتخار عارف، پیش لفظ ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' از ڈاکٹر الف۔د۔نسیم۔

۴) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۹-۱۰۔

۵) ایضاً۔ص۱۰-۱۱۔

۶) ایضاً۔ص۱۵-۱۶۔

۷) اخبارالاخیار فی تذکرۃ الاسرار بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۱۸۔

۸) بزم صوفیہ بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۵۰۔

۹) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۵۰-۵۱۔

۱۰) ایضاً۔

۱۱) مولوی عبدالحق ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' ص۵۔

۱۲) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۵۲۔

۱۳) ایضاً۔ص۵۳-۵۲۔

۱۴) ایضاً۔ص۵۴ بحوالہ سیر الاولیاء از سید مبارک۔

۱۵) محمود شیرانی ''پنجاب میں اُردو)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان''۔۱۹۸۲ء۔ص۲۱۲۔

۱۶) بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص۵۶۔

۱۷) ایضاً ص۶۴ تا ۶۷۔

۱۸) مولوی عبدالحق ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' ص۱۰۔

Marfat.com

۱۹) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردو ے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص ۷۱۔
۲۰) ایضاً۔ص ۷۸۔
۱۲) ایضاً۔ص ۹۹۔
۲۲) ایضاً۔ص ۱۰۰-۱۰۱۔
۲۳) ڈاکٹر سیدہ جعفر ''دکنی نثر کا انتخاب''، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۳ء، پہلا ایڈیشن، ص ۱۰۳۔
۲۴) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردو ے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص ۱۰۲-۱۰۳۔
۲۵) ایضاً۔ص ۱۰۴۔
۲۶) اُردو ے قدیم از شمس اللہ قادری بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ص ۱۰۵۔
۲۷) رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ص ۱۰۸۔
۲۸) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردو ے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص ۱۱۰۔
۲۹) مولوی عبدالحق ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیہ کرام کا کام'' ص ۳۴-۳۵۔
۳۰) ایضاً۔ص ۳۶۔
۳۱) ایضاً۔ص ۳۴۔
۳۲) ایضاً۔ص ۴۹-۵۰۔
۳۳) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردو ے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص ۱۱۶۔
۳۴) ڈاکٹر سیدہ جعفر، مقدمہ ''دکنی نثر کا انتخاب''، ص ۶۔
۳۵) ایضاً۔ص ۸-۹۔
۳۶) مولوی عبدالحق ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' ص ۴۸۔
۳۷) ڈاکٹر سیدہ جعفر ''دکنی نثر کا انتخاب'' ص ۳۱۔
۳۸) ایضاً۔ص ۳۱-۳۲۔
۳۹) ایضاً۔ص ۸۷-۸۸۔
۴۰) مضمون، گوجری اور اُردو زبان کی نشو ونما میں اہلِ گجرات کا حصہ از پروفیسر ابراہیم ڈار، رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء۔
۴۱) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم ''اُردو ے قدیم اور چشتی صوفیہ'' ص ۱۴۲-۱۴۳۔

Marfat.com

۴۲) محمود شیرانی،''پنجاب میں اُردو''،ص۱۴۸۔

۴۳) ڈاکٹر تبسم کاشمیری،''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵۶ تا ۵۸۔

۴۴) ایضاً۔ص ۶۲۔

۴۵) ایضاً۔

۴۶) محمود شیرانی''مقالاتِ شیرانی''مظہر محمود شیرانی، مرتب، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، جلد اوّل ۱:۲۷۷۔

۴۷) ڈاکٹر تبسم کاشمیری،''اُردو ادب کی تاریخ''جلد اوّل، ص ۶۲-۶۳۔

۴۸) ایضاً۔''اُردو ادب کی تاریخ''جلد اوّل، ص ۶۳-۶۴۔

۴۹) ایضاً۔ص ۶۴۔

۵۰) ایضاً۔ص ۶۶۔

۵۱) پروفیسر ابراہیم ڈار، مضمون''گوجری اور اُردو زبان کی نشوونما میں اہلِ گجرات کا حصہ''، رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

۵۲) ڈاکٹر تبسم کاشمیری''اُردو ادب کی تاریخ''جلد اوّل، ص ۵۶۔

۵۳) ایضاً۔ص ۵۸۔

۵۴) ایضاً۔ص ۵۸-۵۹۔

۵۵) ڈاکٹر جمیل جالبی''تاریخِ ادبِ اُردو''جلد اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔ص ۱۰۸۔

۵۶) ڈاکٹر تبسم کاشمیری''اُردو ادب کی تاریخ''جلد اوّل، ص ۱۰۹۔

۵۷) ایضاً۔

۵۸) ایضاً۔ص ۱۱۰۔

۵۹) ڈاکٹر الف۔د۔نسیم''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیہ''ص ۱۲۶-۱۲۷۔

Marfat.com

Marfat.com

حضرت میاں میرؒ کے عہد کا متصوّفانہ ادب

تاریخِ تصوُّف میں دو دور امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں۔ پہلا ابتدا سے لے کر نویں صدی عیسوی کے آغاز تک اور دوسرا نویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر آگے تک۔ پہلے دور میں تصوُّف کی اساس محض رجحانات پر تھی۔ دوسرے دور میں اس کے اندر مابعد الطبیعاتی مسائل نے فروغ پایا۔ سلسلہ ہائے طریقت کی بنیاد ڈالی گئی۔ پہلے دور میں تارک الدنیا، متوکل اور عزلت گزیں لوگ تھے اور ان کے ہاں جذباتی اور ذوقی کیفیات بھی ہیں، جیسے رابعہ بصریؒ کے اقوال میں وجدانی میلانات ہیں۔ (۱) پہلے دور میں تصوُّف سادہ اور عملی شکل میں موجود تھا اور اس نے کوئی علمی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ دورِ اوّل کے صوفیہ میں خوفِ الٰہی اور حزن و الم کی بڑی اہمیت ہے۔ ڈاکٹر نکلسن (Nicholson) کے بیان کے مطابق اسلام کے دورِ اوّل میں جو صوفی نمازی و عباد تھے ان پر خوفِ الٰہی طاری رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی قہاریت و جباریت کے تصور سے لرزہ براندام رہنا ان کی پہچان قرار پا گئی تھی۔ اس فضائے خوف میں محبتِ خدا کے جذبات اور اس کے رحیم و کریم ہونے کے اعتقادات کچھ دبا ہوا پہلو اختیار کیے ہوئے تھے۔ (۲) ابتدائی دور کے صوفیہ کا راستہ ترکِ دنیا، نفس کُشی اور ریاضت کا راستہ تھا۔ خوف ان کے راستے کا رہبر تھا اور محبت اُن کی دوست تھی جو خوف کو عبور کر کے ذاتِ الٰہی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ تصور کرتی تھی۔ دورِ اوّل کے صوفیہ کی زندگی فقر و فاقہ کے ساتھ تمام تر توکل و صبر اور عشق و محبت کا ایک تسلسل تھی۔ (۳)

دورِ اوّل کے صوفیہ نے روحانیت اور اخلاص و اخلاق کی اقدار کی تبلیغ کی۔ لوگوں کو روحانی بلندی کی طرف مائل کیا۔ ضبطِ نفس اور درویشی کے مسلک کو فروغ دیا۔ حکمرانوں کے سامنے

Marfat.com

دستِ احتیاج بلند نہ کر کے توکل کا درس دیا اور اللہ کی رضا پر زور دیا۔ سچ اور حق گوئی کی تعلیم دی۔ طبقۂ اوّل کے صوفیہ نے اپنی اخلاقی و روحانی قوت سے اور اپنے مثبت رویوں سے عوام میں اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ فرماں رواؤں کی طاقت ان کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ وہ پہلی صدی ہجری میں ایک نا قابلِ تسخیر طاقت بن گئے۔ (۴)

دوسرے دور میں تصوُّف فلسفیانہ نظام کی شکل اختیار کرنے لگا۔ بقول سید صفی حیدر تیسری صدی ہجری میں تصوُّف ایک باضابطہ علم کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اب اس کی خاص خاص اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ (۵) اسی زمانے میں سیاست اور شریعت کے درمیان خلیج پیدا ہونے لگی تو دوسرے دور کے صوفیہ نے عشق اور علمِ باطن پر زور دیا۔ حضرت سری سقطیؒ اور حضرت معروف کرخیؒ کا فلسفۂ توحید اختیار کیا گیا جس نے آگے چل کر وحدت الوجود کی شکل اختیار کر لی۔ اس دور کے صوفیہ نے عقل کے اندھیروں میں عشقِ الٰہی کا چراغ روشن کر کے انسانوں کو یقین و ایمان کی قوت عطا کی اور اسلامی عقائد و فکر کو مستحکم کیا۔ (۶)

اب ہم تیسرے دور کا ذکر کرتے ہیں۔ اس دور میں سلسلے اور خانقاہیں قائم ہوئیں اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دور میں تصوُّف کے ادب میں بھی اضافہ ہوا۔ ابن عربیؒ نے اسی دور میں وحدت الوجود کی تعلیم دی۔ اس دور کے صوفیہ نے انسانیت اور سلامتی کا درس دیا۔ اصلاحِ باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور اخلاقی قدروں کا شعور بیدار کیا۔ اسی دور میں ایران کی صوفیانہ شاعری نے تمثیلی ذخیرہ عطا کیا۔ برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ نے شریعت اور طریقت کو ہم آہنگ کیا۔

حضرت میاں میرؒ کے عہد کا تعلق تصوُّف کے تیسرے دور سے ہے۔ حضرت میاں میرؒ سندھی الاصل تھے۔ پاک و ہند میں تصوُّف کے حوالے سے سندھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پاک و ہند کا شاید ہی کوئی صوفی اور بزرگ ہو جس کا تعلقِ خاطر سندھ کی سرزمین سے نہ ہو۔ یوں تو سندھ کا چپا چپا گوشہ گوشہ تصوُّف و عرفان اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا ہے لیکن قدیم شہروں میں الور، دیبل سیوستان، صفورہ، ٹھٹھہ، بھکر وغیرہ اور جدید شہروں میں روہڑی، لواری وغیرہ کو ہمیشہ سے اس سلسلہ میں مرکزی حیثیت رہی ہے اور یہی شہر عرفان و تصوُّف، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے

Marfat.com

سرچشمہ بنے رہے اور یہاں کی خانقاہوں نے ایمان اور عمل کی قوتوں کو اجاگر کر کے خدا شناسی کی فضا قائم کی ہے۔(۷)

حضرت میاں میرؒ کا نام میر محمد اور کنیت میاں میرؒ ہے۔ سیوستان آپ کا وطن تھا۔ بقول قاضی جاوید:

''مغلیہ دور کے پنجابی صوفی دانشوروں میں میاں محمد میر نہایت ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ پورے ہندوستان میں ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی اور ہندوستان کے فکری اور صوفیانہ حلقوں میں انھیں عزت و احترام حاصل تھا۔ کمال وفضیلت کے باوجود انھوں نے سقراط کی طرح اپنے خیالات قلمبند نہیں کیے۔ ان کے حالات وتعلیمات کا شعور حاصل کرنے کے لیے ہم زیادہ تر مغل شہزادے داراشکوہ کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ شہزادہ میاں محمد میرؒ کے مرید اور جانشین ملّا شاہ بدخشانی کا مرید تھا اور اس نے براہِ راست ہمارے ممدوح سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔''(۸)

حضرت میاں میرؒ کے سالِ ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود داراشکوہ نے تین مختلف مقامات پر تین مختلف سنہ درج کیے ہیں۔ چناں چہ سفینۃ الاولیا میں اس نے ۹۵۷ھ سنہ درج کیا ہے اور سکینۃ الاولیا میں ۹۷۵ھ اور ۹۳۸ھ کی تاریخیں بھی دی ہیں۔ فی زمانہ ۹۵۷ھ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ داراشکوہ کا یہ بیان ہے کہ:

''میاں محمد میرؒ کے بھتیجے نے ان کے قریبی عزیزوں اور سیوستان کے معزز اور معتبر اصحاب کے حوالے سے اس سنہ کی تصدیق کی تھی۔''(۹)

حضرت میاں میرؒ کا تعلق ایک معزز علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد بلند پایہ صوفی اور عالم تھے اور سارے سندھ میں مشہور تھے۔ آپ کی والدہ بی بی فاطمہ بھی علومِ باطنی کا درک رکھتی تھیں اور اپنے وقت کی رابعہ تھیں۔ اپنے صاحبزادے کی تعلیم وتربیت میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ سات سال کی عمر میں والد کی وفات کے بعد آپ کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری آپ کی والدہ نے سنبھالی۔ بارہ سال کی عمر میں والدہ نے روحانی تعلیم دینی شروع کی۔

Marfat.com

حضرت میاں میرؒ کی ذہنی نشو ونما میں ان کے ننھیال کی علمی وثقافتی روایت کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے نانا قاضی قادن اپنے عہد کے بڑے دانشور اور سندھ کے قاضی القضاۃ تھے۔ سندھ کی علمی وثقافتی تاریخ میں ان کا نام آج بھی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ علم قرأت کے بھی ماہر تھے۔ فقہ، تفسیر، حدیث، تصوُّف اور انشا پردازی میں انھیں کمال حاصل تھا اور راہِ سلوک میں انھوں نے بڑی سخت ریاضتیں کی تھیں۔ حرمین شریف کی زیارت کرنے کے بعد کافی سیر وسیاحت بھی کی تھی۔ اُن کے زمانے میں سندھ مسلم فکری سرگرمیوں کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تحریک مہدویت کے بانی سید محمد جونپوری وسط ہند، دکن اور گجرات کے علاقوں سے علما اور امرا کی مخالفت کی بنا پر جلاوطن ہوتے ہوئے سندھ آ پہنچے تھے۔ وہ کچھ عرصہ اس علاقے میں مقیم رہے۔ یہاں بھی انھوں نے تبلیغی واصلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ (۱۰)

ان سرگرمیوں کے نتیجے میں سندھ میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ بہت سے لوگ سید محمد جونپوری کی تعلیمات اور شخصیت سے متاثر ہوکر ان کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ ان لوگوں میں قاضی قادن بھی شامل تھے۔ تحریکِ مہدویت بنیادی طور پر احیائے مذہب کی تحریک تھی، تاہم اس کے بانی کے نظامِ فکر میں بہت سے انحرافی عقائد بھی شامل تھے۔ (۱۱) زندگی کے آخری ایام میں قاضی قادن نے ترک وتجرید قبول کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ان کا یہ عمل بھی مہدوی تعلیمات سے ہم آہنگ تھا۔ ان تعلیمات میں نبوت پر ولایت کو ترجیح دینا، شریعت اور طریقت میں امتیاز روا رکھنا، ترکِ دنیا اور سفر اختیار کرنا شامل تھے۔ ان تعلیمات کے اثرات حضرت میاں میرؒ تک ان کی والدہ کی وساطت سے پہنچے۔ (۱۲)

حضرت میاں میرؒ نے ابتدائی تعلیم والدہ سے حاصل کی۔ بعدازاں اپنی والدہ کی اجازت سے دنیوی تعلقات چھوڑ کر والدہ سے رخصت ہوکر ریاضت اور مجاہدہ کی غرض سے نکلے اور سیوستان کے علاقے میں گھومنے لگے۔ یہاں ان کی ملاقات شیخ خضر سیوستانی قادری سے ہوئی جو اپنے عہد کے عارفِ کامل اور نامور بزرگ تھے۔ حضرت میاں میرؒ ان کے مرید ہوئے اور ان کی صحبت سے ادراک پاکر تھوڑے ہی عرصہ میں روحانیت کے درجۂ کمال کو پہنچے۔ حضرت میاں میرؒ

Marfat.com

نے ظاہر میں حضرت خضر سے بیعت کی لیکن حقیقت میں وہ اویسی تھے اور آپ کی روحانی تربیت براہِ راست حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ نے کی۔ آپ غوثِ اعظمؒ کے نامِ نامی کو بے وضو نہیں لیتے تھے۔ حضرت میاں میرؒ زمانہ کے قطب، امامِ طریقت، واقفِ اسرارِ حقیقت، علومِ ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار اور عارفِ کامل گزرے ہیں۔ ظاہری اور باطنی حقیقت اور قابلیت میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے سے بڑے فاضل شخص کو بھی ان کے سامنے مجالِ سخن نہ ہوتی تھی۔ (۱۳)

حضرت میاں میرؒ شیخ خضر سے تربیت پانے کے بعد لاہور چلے گئے۔ لاہور میں شیخ سعداللہ کے درس میں شرکت کی۔ شیخ سعداللہ عہدِ اکبری کے وہی ممتاز درویش ہیں جن سے شاہ حسین نے بھی علم حاصل کیا تھا۔ شیخ سعداللہ کے حوالے سے حضرت میاں میرؒ کو صوفیانہ آزاد خیالی اور ترمیم پسندی کے رجحانات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ لاہور میں زندگی پرسکون انداز میں بسر ہوئی۔ لاہور میں چرچے ہوئے تو سرہند چلے گئے مگر کچھ عرصے بعد لوٹ آئے۔

سولھویں صدی عیسوی کے پنجاب کی ثقافتی صورت حال بھگتی تحریک، چشتیہ تعلیمات، فلسفۂ وحدت الوجود اور اکبرِ اعظم کی بنا پر انسان دوستی اور آزاد خیالی سے معمور تھی۔ محبت اور بھائی چارے کے چرچے تھے۔ مذہب کی توجیہ وسیع تر مفہوم میں کی جا رہی تھی۔ تنگ نظری اور تعصب روحِ عصر سے خارج تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب سے باہر مغلیہ سلطنت کے مرکزی علاقوں میں روحِ عصر کے خلاف ردِعمل شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں میں تلسی داس نے ادب کے حوالے سے ہندو گروہی تشخص کو ابھارنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے زمانے کو عہدِ تاریک کا عنوان دیا اور اکبری حکمتِ عملی کو اپنے گروہی مفاد کے خلاف ٹھہرایا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ احمد سرہندی نے آزاد خیالی کے مسلک کو چیلنج کیا اور احیائے دین کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ان بزرگانِ دین میں سے شیخ احمد سرہندی زیادہ نامور ہیں۔ انھوں نے برصغیر میں مسلم روشن خیالی کو مٹانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی لیکن سولھویں صدی کے پنجاب میں ان کی تحریکِ احیائے دین کے اثرات نہیں پہنچے تھے۔ اس زمانے تک ان کے خیالات زیادہ تر مرکزی علاقے کی مسلمان اشرافیہ تک محدود تھے۔ (۱۴)

جب سلطنتِ مغلیہ کے مرکزی علاقوں میں احیائے دین کی تحریکیں تقویت پکڑنے

Marfat.com

لگیں تو پنجاب میں ان کے خلاف ردعمل نے کئی صورتوں میں اظہار کیا۔ واضح ترین اظہار کے لیے تصوُّف کے قادریہ مسلک کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ بقول قاضی جاوید فی زمانہ یہ مسلک صوفیانہ راسخ الاعتقادی کا ممتاز ترین مظہر ہے لیکن سولھویں اور سترھویں صدی میں یہ صوفیانہ بغاوت کا علمبردار بن گیا تھا۔ (۱۵)

پنجاب میں قادریہ مسلک کا رواج پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا تھا جب کہ حلب کے ایک قادری دانشور سید محمد غوث اپنے وطن سے ہجرت کر کے ۱۴۸۲ء میں اوچ شریف میں آ ٹھہرے۔ وہ ظاہری اور باطنی علوم میں دسترس رکھتے تھے اور انھوں نے اپنے افکار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ (۱۶)

اکبرِ اعظم کے زمانے تک قادریہ تعلیمات پنجاب میں عام ہو چکی تھیں اور قادریہ تصوُّف کا مقامی خانقاہوں میں چرچا عام تھا۔ اور بقول قاضی جاوید:

> ''اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تعلیمات پنجاب کے مخصوص لبرل ازم سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔ جس طرح پنجاب میں بھگتی تحریک نے سید علی ہجویریؒ اور چشتیہ اکابرین کی تعلیمات کو جذب کر لیا تھا۔ اسی طرح قادریہ مسلک نے بھگتی تحریک کے اثرات قبول کر کے انھیں اظہار کی ایک نئی صورت دی تھی۔ یہ نئی صورتِ اظہار صوری طور پر اسلامی تصوُّف سے مستعار ہونے کی بنا پر اہلِ پنجاب کے لیے زیادہ پُرکشش تھی۔'' (۱۷)

حضرت میاں میرؒ کے عہد کے ذکر کے بعد صوفیانہ ادب کی بات کرتے ہیں۔

صوفیانہ ادب

ہر دور کا ادب اُس دور کی رائے عامہ اور اس کے معاییر و اقدار پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعری اور نثر دونوں میں روحِ عصر جلوہ گر ہوتی ہے۔ لوگوں کو رشد و ہدایت دینے کے لیے صوفیہ کی لسانی اور صوفیانہ خدمات کو 'صوفیانہ ادب' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ صوفیانہ ادب میں صوفیانہ نثر اور شاعری کے علاوہ صوفیانہ خطوط، ملفوظات اور صوفیانہ اقوال بھی شامل ہیں۔ صوفیہ کی خانقاہوں اور درگاہوں میں صوفیانہ ادب ایک تسلسل کے ساتھ تخلیق ہوتا رہا۔

Marfat.com

صوفیانہ ادب میں اُس دور کا باطنی شعور بول رہا ہوتا ہے اور صوفیہ اپنی روحانی دانش کو اپنی تحریروں میں منتقل کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دکنی ادب میں ابتدا میں زبان کا ایک منصب صوفیانہ تصورات کا اظہار تھا۔ قدیم اُردو کے سلسلے میں دکن میں حضرت میراں جی شمس العشاقؒ اور اُن کے خاندان کے جانشینوں نے صوفیانہ ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ دکنی طرزِ احساس میں صوفیانہ تصورات بنیادی اساس کے طور پر کام کر رہے تھے۔ دکنی نثر میں امین الدین اعلیٰؒ کا تقریباً تمام تر تصنیفی کام تصوُّف کے بارے میں ہے۔ نثر کے علاوہ شاعری میں 'دوہا' اور ''جکری' بھی صوفیانہ ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ دوہا پندرھویں صدی میں ایک مقبول صنف تھی اور یہ صنف اس دور کے عام آدمی کی اخلاقی تربیت اور اصلاح کا ذریعہ بن گئی تھی۔ دوہے میں سوز و گداز کی کیفیت صوفیانہ طرزِ احساس کی اخلاقیات بھی ملتی ہے۔

صوفیانہ ادب میں جکری بھی دوہے کی طرح صوفیانہ اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ جکری میں بنیادی طور پر ذکرِ خدا، ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ذکرِ پیر و مرشد اور ذکرِ تجرباتِ باطنی و وارداتِ روحانی کو عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا تھا جسے گایا بھی جا سکے۔ جکری میں مریدوں اور طالبوں کے لیے ناصحانہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ ویسے بھی شاعری اور تصوُّف کا گہرا تعلق ہے۔

حیدر دانش لکھتے ہیں:

> ''تصوُّف وجدِ شاعرانہ کی ایک آئینی شکل ہے اور شاعری ذوقِ صوفیانہ کی ایک والہانہ صورت کہی جا سکتی ہے۔ ہر صوفی ذوقِ شعر سے اور ہر شاعر تصوُّف سے فطری لگاؤ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوُّف و شاعری میں ان کے باہمی اشتراکِ وجدانیت کے سبب سے ایک ایسا بنیادی رابطۂ اتحاد قائم ہے جو کسی حالت میں منقطع نہیں کیا جا سکتا۔''(۱۸)

تصوُّف اور شاعری میں سماع، رمزیت اور اخفائے راز مشترک چیزیں ہیں، اسی لیے پنجاب کے بڑے بڑے صوفی شاعر بھی تھے جیسے سلطان باہوؒ، شاہ حسینؒ وغیرہ۔ شاہ حسینؒ، سلطان باہوؒ اور میاں میرؒ کا تعلق ایک ہی صدی سے تھا۔ تینوں کا تعلق قادریہ سلسلے سے تھا۔ میاں میرؒ کی صوفیانہ تحریروں کے ساتھ ساتھ شاہ حسینؒ اور سلطان باہوؒ کی تعلیمات اور شاعری کو بھی اُس عہد

Marfat.com

کے صوفیانہ ادب کے زمرے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے روحانی فیض کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ سندھ اور پنجاب کے علاوہ دوسرے علاقوں کے لوگ بھی آپ سے مستفیض ہوتے رہے۔ عوام کے ساتھ ساتھ آپ نے بادشاہوں کے دلوں پر بھی حکومت کی۔ رواداری کا عالم یہ تھا کہ ان کی بزرگی کا چرچا مسلمانوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ہندو اور سکھ بھی ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ خاص طور پر گوروارجن سنگھ حضرت میاں میرؒ کے بڑے مداح تھے۔ امرتسر میں دربار صاحب کی عمارت تعمیر کروانے کا ارادہ کیا تو گوروارجن سنگھ نے لاہور آ کر حضرت میاں میرؒ سے اُس عمارت کا سنگِ بنیاد اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھنے کی درخواست کی۔

یہ بین المذہبی احترام ان کو اُن کے ترکیبی رویّے اور انسان دوستی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ تصوُّف مذہب کی طرح ایک عالمگیر صداقت ہے۔ اس ترکیبی رویے اور انسان دوستی کی بنیاد فلسفۂ وحدت الوجود ہے۔ حضرت میاں میرؒ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ تاہم وہ عام طور پر اس کے مسائل کو خفیہ رکھنا پسند کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ وحدت کی بات تو سراب کے مانند ہے۔ سراب سے کون سیراب ہو سکتا ہے۔ عامی وحدت کی بات کرے گا تو محض رسوائی ہو گی۔ دارا شکوہ نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ وحدت کی بات کو سراب سے تشبیہ دینے میں ان لوگوں کی طرف اشارہ مطلوب ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے سمجھنے اور قبول کرنے کی اہلیت سے محروم رکھا ہے۔ (۱۹) اس باب میں میاں میرؒ حسین بن منصور کا ذکر کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ منصور نے بھید افشا کیا اور سزا پائی۔ حوصلہ ہوتا تو راز پوشیدہ رکھتے۔ ایسے لوگ بھی تو ہیں کہ دریائے وحدت پی جاتے ہیں اور لب نہیں کھولتے۔

قاضی جاوید لکھتے ہیں:

''توحید کی بابت صوفیانہ مسائل کو خفیہ رکھنا اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وحدت الوجودی خیالات کے فروغ سے صوفیوں اور عقیدہ پرستوں کے درمیان اختلافات بہت بڑھ چکے تھے۔ اکبرِ اعظم کے بعد حکمرانوں میں بھی تصوُّف کے خلاف بیزاری پیدا ہو رہی تھی۔ صوفیوں میں بھی

Marfat.com

وحدت نہ رہی تھی۔ شریعت اور طریقت کے معاملات نے انھیں کئی
گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔''(۲۰)

اگرچہ صوفیانہ ادب میں وحدت الوجود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن مذکورہ معروضی صورتِ حال میں میاں محمد میرؒ نے شریعت اور طریقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اعتدال پسند تھے۔ انتہا پسندی اُن کے نزدیک پسندیدہ فعل نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ فلسفۂ وحدت الوجود پر شدت سے اصرار شریعت اور طریقت میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ انھوں نے اس فلسفے کی موشگافیوں کو پوشیدہ رکھا اور شریعت اور طریقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور فرد کی روحانی تکمیل کے عمل کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا۔ پہلا مرحلہ شریعت کا ہے۔ اس کا تعلق نفس سے ہے۔ روحانی کمال کے متلاشی کو اوّلین اصلاحِ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اصلاح شرعی احکامات پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا مرحلہ دل کی اصلاح ہے، اس کے لیے طریقت کے اصولوں کی پابندی کرنا ہے۔ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو فرد کی آنکھوں سے بشریت کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ وہ حقیقت کے نور کو پا لیتا ہے۔ یہ روحانی ارتقا کا آخری اور اعلیٰ ترین درجہ ہے جس کا تعلق روح سے ہے۔ حضرت میاں میرؒ فرماتے ہیں:

''سالک کے لیے سلوک میں پہلا مرتبہ شریعت ہے۔ طالب کے لیے
ضروری ہے کہ اس کے حفظِ مراتب کی کوشش کرے اور جب کوشش سے
اس مرتبے کو قائم کرے گا تو شریعت کے ادائے حقوق کی برکت سے اس
کے دل میں طریقت کی خواہش خود بخود پیدا ہو جائے گی اور جب طریقت
کے حقوق کو بھی اچھی طرح سے ادا کرے گا تو اللہ بشریت کے حجاب اس
کی دلی آنکھوں سے دور کر دے گا اور حقیقت کے معنی اس پر منکشف ہو
جائیں گے جو روح کے متعلق ہے۔''(۲۱)

روحانی ارتقا کے عمل میں شریعت کو اوّلین مرحلہ قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اگلے مرحلوں میں شرعی احکام کی اہمیت ختم یا کم ہو جاتی ہے۔ میاں میرؒ کے نزدیک اس کے معنی محض یہ ہیں کہ پہلے مرحلے میں شرعی احکام، اصول اور عقائد فرد کی ذات کا جزو نہیں بنتے۔ وہ انھیں خارجی

Marfat.com

حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ روحانی ارتقا کے اعلیٰ تر مراحل میں وہ فرد کی ذات کا حصہ بنتے ہیں۔ اب فردان کے لفظی مفاہیم ہی نہیں سمجھتا بلکہ داخلی تجربے کے ذریعے ان کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔ (۲۲)

حضرت میاں میرؒ کا شرع کی پابندی پر ہمیشہ اصرار اس لیے ہوتا کہ تصوُّف اپنی اصلی صورت میں اسلام کی کامل ترین صورت ہے اور اسلامی تصوُّف قرآن وشریعت سے ماخوذ ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک ایک ہاتھ میں کتابِ خدا اور دوسرے ہاتھ میں سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ پکڑ لو، اس راستہ پر نہ چلو تا کہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرو اور نہ بدعت کی تاریکی میں مبتلا ہو سکو۔ (۲۳)

تصوُّف میں شریعت اور طریقت کی دوئی نہیں ہے بلکہ شریعت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنے کو تصوُّف کہا جاتا ہے۔ حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت اور شریعت کو قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام تصوُّف ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ اعمالِ باطنی سے متعلق شریعت کا جز وتصوُّف وسلوک کہلاتا ہے۔ اس لیے تصوُّف وطریقت دین وشریعت کے قطعاً منافی نہیں بلکہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ صوفی بنے کہ اس کے بغیر مسلمان پورا مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں رہتا۔ (۲۴)

حضرت میاں میرؒ زندگی میں عمل کے قائل تھے۔ داراشکوہ روایت کرتا ہے کہ وہ یہ شعر اکثر گنگنایا کرتے تھے کہ: ''کام کر کام، باتیں چھوڑ کہ اس راہ میں کاموں ہی سے سابقہ ہے'' (۲۵) عمل پرستی کے حوالے سے وہ فرد کی روحانی پیدائش نو میں یقین رکھتے تھے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے۔ نئے اعمال سے نیا فرد جنم لیتا ہے۔ مقدر عمل بناتا ہے۔ فرد اپنی تکمیل خود کرتا ہے۔

حضرت میاں میرؒ اللہ تک پہنچنے کے دو طریقے بتاتے ہیں:

> ''اوّل جذبہ کہ اللہ تعالیٰ یک بارگی بندہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس کو واصل بنا دیتا ہے اور دوسرا سلوک جو ریاضت، مجاہدے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑنے سے اللہ تعالیٰ تک پہنچے۔'' (۲۶)

حضرت میاں میرؒ کے نزدیک کامل صوفی وہ ہے جس کی نگاہ میں پتھر اور سونا یکساں

Marfat.com

ہوں۔تصوّف میں فقر کو بادشاہی سمجھا جاتا ہے اور نفس کو لذّات کا اسیر۔نفس خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہے اس لیے اس کے ساتھ برسرِ پیکار رہنا تصوّف میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ نفس کی مخالفت میں تمام عبادتوں کا راز ہے۔حضرت میاں میرؒ نفس کی موت کو حیاتِ ابدی کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں۔اُن کا قول ہے:

''اولیا کی موت ان کے نفس کا مرنا ہے اور جب نفس مر جاتا ہے تو پھر وہ ابدالآباد تک زندہ ہی رہتے ہیں۔''(۲۷)

علی بن عثمان الہجویریؒ کے نزدیک شرطِ ادبِ سماع یہ ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو سماع نہ کرے اور اسے عادت نہ بنائے (۲۸)۔حضرت میاں میرؒ سے ایک شخص نے سماع و وجد کے بارے میں دریافت کیا۔جواب میں آپ نے سعدی کے شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اگر میں سماع کرنے والے کو جان لوں کہ وہ کون ہے تو اے بھائی میں تمھیں بتاؤں کہ سماع کیا ہے؟ اگر اس کا طائرِ خیال حقیقت کی بلندی سے پرواز کرے تو اس کی پرواز سے فرشتہ بھی عاجز آ جاتا ہے۔اور اگر اس کا مقصد لھو ولعب اور فریب کاری ہے تو اس سے اس کے دماغ کا شیطان قوی ہو جاتا ہے۔''(۲۹)

حضرت میاں میرؒ امرِ الٰہی کی تعظیم ضروری سمجھتے تھے۔فرماتے:

''پس اس کی تعظیم یہ ہے کہ اسے یادِ الٰہی سے غافل نہ رکھا جائے اور خطرات کو دور کیا جائے۔''(۳۰)

حضرت میاں میرؒ حق تعالیٰ کی طلب کو مشکل کام سمجھتے اور اُس کو پانے کے لیے دنیاوی تعلقات کو چھوڑ دینے کی تلقین فرماتے۔وہ فنافی اللہ کی منزل میں تھے۔

حضرت میاں میرؒ کی تعلیمات کی انتہا پسندانہ صورت داراشکوہ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔یہ صوفی شہزادہ میاں میرؒ کے مرید اور جانشین ملّا شاہ بدخشانی کا شاگردِ خاص تھا۔ملّا شاہ بدخشانی نے اپنے مرشد کے ترکیبی رویّے اور وحدت الوجودی خیالات میں شدت پیدا کی تھی۔وہ اظہارِ خیال کے معاملے میں مرشد کی طرح محتاط نہیں تھے۔

Marfat.com

پنجاب کی صوفیانہ تاریخ میں ملاّ شاہ کی اہمیت وحدت الوجودی خیالات کی بنا پر ہے۔ فرماتے ہیں کہ بیس سال ہم اس جستجو میں رہے کہ ظاہراً طور پر اس کی خوشبو حاصل ہو۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ ہم خود اپنی ہی طلب میں تھے۔ یہ رمز ہمیں معلوم ہوئی کہ ہم خود وہی تھے۔ (۳۱)

ملاّ شاہ صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ نظم و نثر دونوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ اُن کے داراشکوہ کے نام لکھے گئے خطوط حکمت کا خزانہ ہیں۔ رسالۂ مرشد بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس میں تصوُّف کے بنیادی اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔ رسالے کا بیشتر حصہ نظم میں ہے۔ وحدت الوجودی مسلک کا دفاع کیا گیا ہے۔ مصنف بتاتا ہے کہ قادر مطلق ہر شے میں جلوہ نما ہے۔ ہر قطرے میں دریا موجزن ہے۔ دریا میں ضم ہونا قطرے کی معراج ہے۔ بظاہر یہ فنا ہے لیکن اصل میں بقا ہے۔

مرشد کی طرح ملاّ شاہ نے شرع کی حدود کے احترام کا درس دیا ہے۔ ایمان کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱) ایمانِ عوام
۲) ایمانِ خواص
۳) ایمانِ خواص الخواص

اگرچہ شاہ حسینؒ، سلطان باہوؒ اور میاں میرؒ کا تعلق ایک ہی صدی سے تھا لیکن ان میں فکر و نظر کے اختلافات نمایاں ہیں۔ شاہ حسینؒ ایک انتہا کی طرف ہو گئے اور سلطان باہوؒ دوسری انتہا کی طرف، جب کہ میاں میرؒ درمیان میں رہے ہیں۔ شاہ حسینؒ کے نزدیک زندگی نغمہ و رقص میں ہے۔ سلطان باہوؒ سُر سے بیزار اور اس کو خلافِ شرع سمجھتے جب کہ میاں میرؒ موسیقی سے آگاہ لیکن وجد و رقص سے احتراز کرتے تھے۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں قادریہ مسلک میں صوفیانہ بغاوت نظر آتی ہے۔ اس نظامِ فکر کا پہلا اظہار شاہ حسینؒ کی صوفیانہ بغاوت کی صورت میں ہوا۔ پنجاب کے اکثر صوفی دانشوروں کی طرح حسینی فکر بھی تعقلاتی سطح تک نہیں اُٹھتا۔ جذباتی حسی سطح پر رہتا ہے۔ شاہ حسینؒ نے شاعری کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ یہ موسیقی آمیز شاعری ہے۔ من موہ لینے والی کافیوں کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔ کافیاں مختلف راگوں اور راگنیوں کے حوالے سے مرتب کی گئی ہیں۔

Marfat.com

بے درد موسیقار انھیں فنی لحاظ سے خام قرار دیتے ہیں۔ حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ:

''سینہ بسینہ چلنے یا غلط انداز سے ماتروں کی کمی بیشی کے ساتھ دھنوں میں جکڑ دینے کے ساتھ ان میں کچھ فرق آ گیا ہے مگر اس کے باوجود ان کی معنویت اور اثر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔''(۳۲)

یہ بات درست ہے کہ ان کافیوں کی مقبولیت میں ان کی موسیقیت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ صوفیانہ اظہار کی یہ صورت بعدازاں پنجاب کی شاعری میں ایک مستقل صنف بن گئی۔ شاہ حسینؒ کی شاعری میں صورت اور مادّہ کے مابین جدلیاتی اضافت موجود ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

شاہ حسینؒ صاحبِ حال صوفی تھے۔ اس کے ساتھ مشاہدہ تیز تھا اور فقر کی منزلیں طے کر چکے تھے، اس لیے اُن کے سادہ الفاظ میں گہرے معانی ہوتے تھے۔ شاہ حسینؒ کا جسم ملامتی اور روح قادری تھی۔ شاہ حسینؒ کے نزدیک خدا اور انسان ایک ہی ذات کے دو مظہر نہیں۔ یہ قائم بالذات وجود ہیں۔ اپنی کافیوں میں انسان کو فانی قرار دیتے ہیں۔ متصوفانہ شاعری میں فنا کا مضمون بہت زیادہ ہے۔

شاہ حسینؒ مابعد الطبیعات فلسفۂ وحدت الوجود سے مختلف اور فلسفہ وحدت الشہود سے قریب تر تھے۔ الٰہیاتی روپ میں اس فلسفے کو شاہ حسینؒ کے معاصر شیخ احمد سرہندی نے پیش کیا تھا۔ شاہ حسینؒ کے اس خیال کی جڑیں قرآن حکیم میں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں جو واضح طور پر خدا کی ماورائیت کا درس دیتا ہے۔ بھگتی تحریک کے علمبرداروں کے ہاں بھی ماورائی خدا کا تصور ملتا ہے۔ پنجاب میں شاہ حسینؒ سے قبل گورو نانک اس تصور کا پرچار کر چکے تھے۔

فرد اور خدا کی باہمی اضافت کے اس تصور پر شاہ حسینؒ کا نظامِ فکر مبنی ہے۔ مطلق وحدت محال سہی لیکن ناپسندیدہ نہیں۔ اصل میں یہ شاہ حسینؒ کے نزدیک محال نصب العین ہے۔ ظاہر ہے اس سے دکھ درد، سوز و گداز، محرومی اور جدائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ شاہ حسینؒ کے کلام میں جابجا اس احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ محبوب کی تلاش کا جذبہ ان کے ہاں دوسرے تمام جذبوں پر حاوی ہے۔

Marfat.com

زندگی سے بے پناہ محبت زندگی کو ''میکا'' اور موت کے بعد کی صورتِ حال کو ''سسرال'' بنا دیتی ہے۔ یہ تصور شاہ حسین کو دیگر صوفیہ سے ممتاز کر دیتا ہے۔

اب ہم آخر میں میاں میرؒ کے زمانے کے صوفیانہ ادب کے سلسلے میں حضرت سلطان باہوؒ کی صوفیانہ شاعری کی بات کریں گے۔

سلطان باہوؒ کا تعلق قادری مکتبۂ فکر سے تھا۔ علوم وفنون کی باقاعدہ تدریس سے محروم رہنے کے باوجود تصنیف وتالیف سلطان باہوؒ کا مشغلہ تھا۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک سو چالیس کے قریب کتب لکھی تھیں۔ ان میں سے بہت سی زمانے کی خرد برد کی نذر ہو چکی ہیں، تاہم ان کے بعض رسالے اور کتب دستیاب ہیں۔ یہ کتب عربی اور فارسی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ لاہور کے تاجرِ کتب ملک چنن دین نے جملہ دستیاب کتب کے اُردو تراجم شائع کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ سلطان باہوؒ کے چند مخصوص موضوعات ہیں۔ مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

عین الفقر، گنج الاسرار، کلید التوحید، نور الہدیٰ، محبت الاسرار، شمس العارفین، رسالہ روحی، مفتاح العاشقین، جامع الاسرار، محکم الفقراء، حجتہ الاسرار، کشف الاسرار، امیر الکونین، قربِ دیدار، کلیدِ جنت، اسرارِ قادری، توفیقِ ہدایت اور تیغِ برہنہ وغیرہ۔ نثری نگارشات کے علاوہ دو شعری مجموعے بھی سلطان باہوؒ سے منسوب کیے جاتے ہیں: ''دیوانِ باہو'' اور ''ابیاتِ باہو'' آپ کی یادگار ہیں۔ ایک مجموعہ فارسی زبان میں ہے اور دوسرا پنجابی میں۔ پنجابی شاعری اُن کی شہرت کا باعث بنی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اپنے روحانی سلسلے کی عظمت کا چرچا کیا ہے جب کہ سلطان باہوؒ کے معاصر قادری بزرگ میاں میرؒ، ملّا شاہ بدخشانی، داراشکوہ اور شاہ عنایت قادری دیگر مکاتبِ فکر کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اور دیگر فرقوں اور مذہبوں کے بارے میں ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ شاعری اور خصوصاً پنجابی شاعری میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ سترھویں صدی کے دیگر قادری دانشوروں سے زیادہ مختلف نہیں۔ چناں چہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ''میں سُنّی ہوں نہ شیعہ، میرا دل ان دونوں سے دُکھا ہوا ہے۔''(۳۳)

حضرت سلطان باہوؒ فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ وہ اس فلسفے کو کائناتی نقطۂ نظر

Marfat.com

کے طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ یہ فلسفہ ان کے ہاں محض صوفیانہ اور شاعرانہ تعقل رکھتا ہے۔ وحدت الوجودی خیالات ''رسالہ روحی'' میں ملتے ہیں اور شاعری میں بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ رسالہ روحی میں ذاتِ باری تعالیٰ کی خلاقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سبحان اللہ! خاکی عناصر کے اجسام ہزار ہا طرح پر اپنی قدرتِ کاملہ کے جلال و جمال کے آثار کے لیے آئینہ باصفا بنائے اور پھر خود اپنے روئے زیبا کا تماشائی بنا۔ گویا خود ہی اپنے ساتھ عشق بازی کرتا ہے۔ خود ہی نظر، خود ہی منظر، خود ہی ناظر، خود ہی منظور، خود ہی عشق اور خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق ہے۔ اگر تو اپنے آپ سے پردہ ہٹا دے تو سب ایک ہی ذات تجھے دکھائی دے۔ یہ دوئی صرف چشمی احوال کی وجہ سے ہے۔ جو عارف واصل ہے وہ جدھر نگاہ کرتا ہے اسے ذاتِ حق کا دیدار دکھائی دیتا ہے اور اپنی خودی اور غیریت کا نقش مٹا دیتا ہے تب ذاتِ مطلق کے ساتھ وہ بھی مطلق ہو جاتا ہے۔''(۳۴)

حضرت سلطان باہوؒ نے طریقت پر شریعت کی کُل برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلطان باہوؒ صحو کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نفسِ امارہ کو انسانی وجود میں بمنزلہ یزید قرار دیتے ہیں۔ انسانی دکھوں اور برائیوں کا منبع خودی کو سمجھتے ہیں۔ اُن کی تعلیمات میں ترکِ دنیا اور نفس کُشی کے خیالات بکثرت ملتے ہیں۔ انسان کو افضل جانتے ہیں اور اُن کے نزدیک انسان کی پیدائش کا مقصد اللہ کی پہچان اور شناخت ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''بڑے تعجب کی بات ہے کہ اپنی بے وقوفی کے سبب قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کے امیدوار بنتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ جو دنیا میں اندھا ہے آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔''(۳۵)

سلطان باہوؒ عمل کے بغیر علم کو دیوانگی قرار دیتے ہیں۔ وہ جملہ دکھوں برائیوں کی وجہ خودی کو کہتے ہیں۔ وہ خودی کو فرد اور خدا کے درمیان حائل دیوار سمجھتے ہیں جسے گرائے بغیر فرد کی روحانی ارتقا کے اعلیٰ مراتب تک رسائی ممکن نہیں۔ اُن کے نزدیک خودی پر غالب آنے کے لیے

Marfat.com

باطنی محنت کی ضرورت ہے اور انسان کے روحانی ارتقا کا اعلیٰ ترین مرحلہ بھی یہی ہے جب کہ فرد عبودیت کے مقام سے نکل کر ربوبیت کے مقام تک جا پہنچتا ہے۔ (۳۶) یہی مقصدِ حیات بھی ہے اور نصب العین بھی۔

اگرچہ بعض مقامات پر وہ اس دنیا اور زندہ رہنے کے عمل کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک پنجابی شعر میں کہتے ہیں کہ ایسا مرشد تلاش کرنا چاہیے جو دین اور دنیا دونوں میں سلامتی اور مسرت کا باعث ہو اور پہلے روٹی کے مسئلے کو حل کرے پھر رب کی راہ دکھائے۔ لیکن یہ ان کا عمومی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شعری اور نثری تصانیف میں انھوں نے انسانی زندگی کو بے مایہ قابلِ نفرت اور شر کا منبع قرار دیا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کو پسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ ان کے نظامِ فکر میں دین اور دنیا دو ایسی متضاد قوتیں ہیں جن کے باہمی تضادات کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جگہ انھوں نے دین اور دنیا کو دو سگی بہنوں سے تشبیہہ دی ہے اور کہا ہے کہ جیسے شرع کی رو سے دو سگی بہنیں ایک ہی مرد کے نکاح میں نہیں آ سکتیں ویسے ہی کوئی شخص بھی دین اور دنیا کو بیک وقت حاصل نہیں کر سکتا۔ (۳۷)

Marfat.com

حواشی

۱) ڈاکٹر تاراچند۔تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات۔مترجم،محمد مسعود احمد۔لاہور:مجلسِ ترقی ادب،طبع دوم: جون۲۰۰۲ء۔ص۲۰۱تا۲۰۳۔

۲) Dr. R.A. Nicholson. A Literary History of the Arabs. P225.

۳) پروفیسر محمد حسن۔دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر۔دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۸۹ء۔ ص۲۴۴۔

۴) اعجاز الحق قدوسی۔اقبال کے محبوب صوفیہ۔پیش لفظ۔پاکستان:اقبال اکادمی،طبع دوم:۱۹۸۲ء۔

۵) پروفیسر سید صفی حیدر۔تصوف اور اردو شاعری۔لاہور:سندھ ساگر اکادمی،ستمبر۱۹۴۸ء۔ص۷۷۔

۶) اعجاز الحق قدوسی۔اقبال کے محبوب صوفیہ۔پیش لفظ۔

۷) سید حسام الدین راشدی۔پیش لفظ۔تذکرہ صوفیائے سندھ۔کراچی: اُردو اکیڈمی، بارِ اوّل،نومبر ۱۹۵۹ء۔ص۲۰،۲۱،۲۳۔

۸) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔لاہور:نگارشات۔اگست۱۹۸۶ء۔ص۱۸۹۔

۹) داراشکوہ۔سکینۃ الاولیا اُردو ترجمہ از پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی۔ص۱۱۸۔

۱۰) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص۱۹۱۔

۱۱) قاضی جاوید۔برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا۔ص۱۰۹-۱۲۰۔

۱۲) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص۱۹۱-۱۹۲۔

۱۳) داراشکوہ۔سفینۃ الاولیا۔کراچی:نفیس اکیڈمی،طبع ہفتم:مئی۱۹۸۶ء۔ص۱۰۱-۱۰۲۔

۱۴) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص۱۴۷۔

۱۵) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص۱۴۷۔

۱۶) محمد دین کلیم قادری۔تذکرہ مشائخِ قادریہ،ص۱۵۵۔

۱۷) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص۱۴۸۔

Marfat.com

۱۸) پروفیسر صفی حیدر دانش۔تصوف اور شاعری۔ص ۲۱۔

۱۹) داراشکوہ۔سکینۃ الاولیاء اُردو ترجمہ از پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی۔ص ۸۵۔

۲۰) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص ۱۹۷۔

۲۱) سکینۃ الاولیا بحوالہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب۔تذکرہ اولیائے پاک و ہند۔لاہور: الفیصل۔سنہ ندارد۔ ص ۲۴۸۔

۲۲) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص ۱۹۸۔

۲۳) فریدالدین عطار۔تذکرۃ الاولیا۔کراچی: شمع بک ایجنسی۔۲۰۰۲ء۔ص ۲۹۰۔

۲۴) مولانا اشرف علی تھانوی۔شریعت و تصوف۔ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ۔۱۹۸۳ء۔ص ۹۲۔

۲۵) داراشکوہ۔سکینۃ الاولیاء۔ص ۱۱۰۔

۲۶) سکینۃ الاولیا بحوالہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب۔تذکرہ اولیائے پاک و ہند۔ص ۶۶۔

۲۷) ڈاکٹر ظہور الحسن شارب۔تذکرہ اولیائے پاک و ہند۔ص ۲۴۸۔

۲۸) علی بن عثمان الہجویریؒ۔کشف المحجوب۔مترجم، مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری۔لاہور: اسلامک بک فاؤنڈیشن۔۱۹۷۸ء۔ص ۶۳۱۔

۲۹) ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی۔پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔۲۰۰۰ء۔ص ۱۴۹۔

۳۰) سکینۃ الاولیا بحوالہ تذکرہ اولیائے پاک و ہند۔ص ۲۴۷۔

۳۱) داراشکوہ۔سکینۃ الاولیا۔ص ۱۹۱-۱۹۲۔

۳۲) عبدالمجید بھٹی۔کافیاں شاہ حسین (منظوم اردو ترجمہ)، ص ج۔

۳۳) سلطان الطاف علی۔ابیاتِ باہو۔ص ۵۸۶۔

۳۴) سلطان باہوؒ۔ رسالہ روحی، اردو ترجمہ۔ص ۲-۳۔

۳۵) سلطان باہوؒ۔محکم الفقراء، ص ص ۲۳-۲۴۔

۳۶) سلطان باہوؒ۔محکم الفقراء، ص ۱۵۔

۳۷) قاضی جاوید۔پنجاب کے صوفی دانشور۔ص ۱۸۷۔

Marfat.com

حضرت نظام الدین اولیاؒ: افکار واثرات

سلطان علاءُالدین خلجی کے عہد میں سلطنتِ دہلی اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی اور اسی عہد میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے چشتیہ سلسلہ کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ اگر چہ دہلی میں چشتیہ سلسلہ کا مرکز شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی کوششوں سے قائم ہوا۔ انھوں نے سلطان شمس الدین ایلتتمش کے عہد میں دہلی آ کر ارشاد و تلقین کا انقلاب برپا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی حیثیت ایک بین الاقوامی شہر کی سی ہوگئی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں علما، مشائخ، شعرا و ادبا دہلی کی طرف آ رہے تھے۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ہاتھوں پڑی۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اسے منظم کیا اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے چشتیہ سلسلہ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے زمانے میں تصوُّف نظری اور تخلیقی مزاج رکھتا تھا۔ یہ دور قلبی تجربے سے پیدا ہونے والے فکر و نظر کا دور تھا اور صوفیائے چشت اس دور کی روحانی طاقت تھے۔ اس دور کی تصوُّف کی فضا کے متعلق پروفیسر جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں تصوُّف ابھی اپنے نظری اور تخلیقی مزاج کا حامل تھا اور زمانی مسافت اور فاصلہ، جو اہلِ فکر و نظر کے تجربے اور واردات اور بعد میں آنے والی نسلوں کے درمیان حائل ہوتا ہے، ابھی حائل نہیں ہوا تھا اور ہر چند کہ بغداد تباہ ہو چکا تھا اور علوم کے مراکز اہلِ عجم کی سرزمینوں میں اجڑ چکے تھے، سلطنتِ دہلی کی علمی اور فکری فضا میں ان مراکز کے دیے ہوئے

Marfat.com

علم وحکمت کی شعاعیں ابھی نہ صرف چمک رہی تھیں بلکہ ان کی چمک میں وہ کیفیت بھی برابر زندہ تھی جو سورج کے طلوع ہوتے وقت صبح کی تازہ روشنی میں نظر آتی ہے۔ تصوُّف ایک قلبی، علمی اور فکری تجربے کے طور پر زندہ تھا۔''(۱)

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی جس وقت داغ بیل پڑی تھی، اسلامی تصوُّف کی تدوینِ فکر کا کام تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ شیخ ابونصر سراجؒ، امام قشیریؒ، ابو طالب مکیؒ اور امام غزالیؒ کے فکری کارنامے صوفی حلقوں میں غور وفکر کا عنوان بنے ہوئے تھے؛ تصوُّف کا پورا فلسفہ مدون ہو چکا تھا اور تصوُّف کی تحریک تنظیمِ سلاسل کی منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے تصوُّف کے پورے فکری سرمایہ اور تنظیمی اصولوں سے باخبر ہو کر زمینِ ہند پر قدم رکھا تھا۔ اُنھوں نے طریقت میں ترکِ دنیا کے مفہوم کی وضاحت کے لیے شیخ حمیدالدین ناگوریؒ کو ایک رسالہ لکھنے کی ہدایت کی۔ اس رسالے میں شیخ حمیدالدین ناگوریؒ کے نظریات حقیقتاً خواجہ اجمیریؒ ہی کے افکار کی صدائے بازگشت ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ذریعے جو کتابیں رائج ہوئیں اُن میں قوت القلوب، عوارف، احیاء العلوم، رسالہ قشیری، کشف المحجوب اور قاضی حمیدالدین ناگوریؒ کے لوائح اور لوامح۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ جن متقدمین صوفیہ کے افکار سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ، شیخ سیف الدین باخرزیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ہیں۔ ہندوستان کے صوفی مصنفین میں وہ قاضی حمیدالدین ناگوریؒ کے بہت مداح تھے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے زمانے میں صوفیہ نہ مسلک کا نظام مربوط ہو چکا تھا۔ ایمان کی تصدیق کے لیے عقلی دلائل اور منطقی ثبوت ادھورے دکھائی دیتے تھے۔ عقل کی رہنمائی قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ تصدیق بالقلب رہنما اصول تھا اور قلب ہی افضل ترین شعور شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کا عہد تصوُّف کے بزرگوں حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ اور منصور حلاجؒ کے ساتھ مکالمہ کرنے کی صلاحیت سے بھی آشنا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اس عہد میں چشتیہ سلسلہ کا ایک مرکزی نظام تھا۔ اسی مرکزی نظام کے تحت تمام

Marfat.com

متعلقینِ سلسلہ کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح وتربیت ہوتی تھی۔ خواجہ صاحبؒ، قطب صاحبؒ، بابا فریدؒ اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے خلفا اور مریدین ملک کے دور دراز علاقوں میں کام کرتے تھے لیکن ان کی نگاہیں ہمیشہ اجمیر، دہلی یا اجودھن کی طرف لگی رہتی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرکزی نظام کے ماتحت تصور کرتے تھے۔ مذکورہ عہد میں امرا اور سلاطین سے کسی قسم کا تعلق رکھنا روحانی سعادت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔

کوئی ادارہ یا تحریک اُس وقت تک اپنا دائرۂ اثر وسیع نہیں کرسکتی جب تک اُس کے فکر کی بنیاد مضبوط اصولوں پر قائم نہ ہو۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی کامیابی کا راز اُس کا واضح مقصد اور مضبوط لائحہ عمل تھا۔ چشتیہ سلسلہ کی روحانی اور اصلاحی جدوجہد کا مقصد انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا تھا کیوں کہ شخصیت کی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں۔ چشتیہ سلسلہ کے صوفیہ نے مذہب کا ایک انقلابی تصور پیش کیا جو قرآن کی تعلیمات کی روح ہے۔ اس میں مذہب خدمتِ خلق کا دوسرا نام ہے اور بنی نوع انسان کو راحت پہنچانے کی ہر کوشش روحانی کوشش ہے اور حقیقی عبادت ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے مذہب کو بنی آدم کی خدمت اور اس کی بہبود کے لیے جدوجہد کے مترادف بنادیا تھا۔

انسان کو اخلاقی عیوب سے بچانا اور اس کو راہِ شریعت دکھانا مشائخِ چشت کی کوششوں کا محور تھا اور بیعت کا حقیقی مقصد اخلاقی احساس وشعور کو بیدار کر کے اصلاح وتربیت کا سامان فراہم کرنا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص بیعت کرتا ہے وہ حقیقت میں خداوند تعالیٰ سے عہد کرتا ہے، لہٰذا اس کو اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیے۔

ہدایت اور اصلاح کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معلمِ اخلاق خود اُن اخلاقی اقدار کا حامل ہو جن کی تبلیغ وہ دوسروں کو کرتا ہے۔ الفاظ کی تاثیر عمل کی قوت میں ہوتی ہے۔ سلطان المشائخ کے خیال میں جس کام کی تلقین اوروں کو کی جائے پہلے اُس پر عمل کیا جائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بندہ پر عطا وکرم کا دروازہ کھلا رکھتا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کو بھی کرنا چاہیے۔

Marfat.com

فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ ایک شخص حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے ایک مسئلہ پر نہایت سخت گفتگو کرتا ہے۔ شیخ اس کا مدلل جواب دیتے ہیں اور وہ لاجواب ہو کر چلا جاتا ہے۔ شیخ کو پشیمانی ہوتی ہے کہ انھوں نے ایسا جواب کیوں دیا جس سے وہ کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ فرماتے ہیں:

''مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں دو وجہ سے پشیمان ہوا۔ ایک اس واسطے کہ کیوں اس سے یہ بات کہی جس سے وہ ملزم بنا۔ دوسرے چوں کہ وہ مسافر تھا مجھے چاہیے تھا کہ اسے کپڑا یا روپیا پیسا دیتا۔ ان باتوں سے مجھے پشیمانی ہوئی۔''(۲)

معلمِ اخلاق کو خود بینی سے پاک ہونا چاہیے ورنہ وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ایک دن اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ انسان کب برا ہوتا ہے؟ جواب دیا ''جب اپنے تئیں نیک خیال کرے۔''(۳)

پردہ پوشی معلمِ اخلاق کا مسلک ہونا چاہیے۔ برائی کو دور کرنے کے لیے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے نزدیک مؤثر طریقہ قلب کو بیدار کرنا ہے۔ تعلیمِ اخلاق کے لیے وہ اصلاحِ نیت اور استقامت پر زور دیتے تھے۔ عفو و درگذر کا معاملہ اُن کے نزدیک مخالف کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ چھجو نامی شخص حضرت محبوب الٰہیؒ کو ہمیشہ بُرا کہتا اور درپے آزار رہتا تھا۔ اس کے انتقال کے تیسرے دن شیخ اس کی قبر پر گئے اور دعا کی:

''الٰہی! اس نے مجھے جو بُرا کہا اور میرے لیے جو بُرا سوچا، میں نے اس کو معاف کیا۔ تو میری وجہ سے اسے سزا نہ دینا۔''(۴)

کسی انسان کے فکر و عمل میں تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ اُس شخص کے ذہنی محرکات، قلبی کیفیات اور طبعی رجحانات کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ جس صلاحیت کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ''نفس گیرا'' سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقت میں یہ ہی چیز ہے کہ شیخ کی نظر، وجدان یا احساس اتنا تیز ہو کہ وہ آنے والے کے دلی احساسات کو سمجھ لے اور اُس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک لے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ خلافت کے لیے علم، عقل اور عشق کو ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ترکِ

Marfat.com

دنیا کی تلقین بھی کرتے تھے لیکن اُن کے نزدیک ترکِ دنیا یہ ہے کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھائے بھی لیکن جو کچھ اسے ملے اُس کی طرف راغب نہ ہو اور اس سے دل نہ لگائے (۵)۔ شیخ اپنے خلیفہ کو توکل و استغنا سے مالا مال دیکھنا چاہتے تھے۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے جب مولانا حسام الدین ملتانیؒ کو خلافت عطا فرمائی تو شہادت کی انگلی اُٹھا کر دو مرتبہ دنیا کو ترک کرنے کی تلقین کی۔ ترکِ دنیا کے سلسلے میں خلفاء سے چار چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا:

۱) فتوح کو جمع کر کے نہ رکھیں گے

۲) امرا و سلاطین کی صحبت سے پرہیز کریں گے

۳) وظائف قبول نہ کریں گے

۴) ملازمتِ شاہی سے بچیں گے

جو خلیفہ مذکورہ شرائط پر پورا نہ اترتا اُس سے خلافت نامہ واپس لے لیا جاتا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ خلیفہ کی ظاہری و باطنی زندگی کو سنوارتے تھے۔ خلیفہ کے کردار میں خوبیاں پیدا کرنے کے لیے وہ صرف زبان سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ خلیفہ اُن کے عمل سے متاثر ہو کر اُن کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرتا تھا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نظم و ضبط کا بڑا خیال کرتے تھے۔ خلفا سے اوقات کی پابندی کروائی جاتی۔ وہ خانقاہ میں عام آنے والوں سے ملنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن خاص مریدوں میں سے کوئی بے وقت آ جاتا تو اُس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا:

> ''میں نے کہا ہوا ہے کہ جو خاص یار گھر پر میرے پاس آتے ہیں انھیں ضرورت نہیں کہ عام انبوہ میں میرے مزاحم ہوں۔''(۶)

کشف و کرامات کو صوفیہ حجابِ راہ سمجھتے ہیں اور کرامت کے اظہار سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ مریدوں کو احتسابِ نفس کی تلقین کرتے ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے ایک دن یہ حکایت بیان کی کہ بنی اسرائیل میں ایک زاہد تھا۔ اس نے ستر سال عبادت کی۔ ستر سال کے بعد اسے کوئی ضرورت پیش آئی۔ وہ حاجت اللہ تعالیٰ سے طلب کی لیکن پوری نہ ہوئی۔ بعد ازاں اُس

Marfat.com

نے گوشہ میں جا کر اپنے نفس سے جھگڑنا شروع کیا کہ اے نفس! تو نے ستر سال اللہ کی عبادت کی۔ بیشک تیری طاعت میں اخلاص نہ ہوگا۔ اگر تو اخلاص سے عبادت کرتا تو حاجت ضرور پوری ہوتی۔ جب وہ زاہد اس طرح اپنے نفس سے جھگڑ رہا تھا تو پیغمبرِ وقت کو حکم ہوا کہ اس زاہد سے کہو کہ تیرا نفس کے ساتھ ایک ساعت پر جھگڑنا اس ستر سال کی عبادت سے ہمارے نزدیک بہتر ہے۔ (۷)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ دینی معاملات میں سہولت پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر بیعت کے شرائط وقواعد کو وہ پہلے ہی سے بیان کر دیں تو بہت سے لوگ محروم رہ جائیں۔ انسانی فطرت کو بیک وقت بہت سے اصول وقواعد کی بندش میں جکڑنا اچھا نہیں۔ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ ان پر ڈال دینا نفسیاتی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ (۸)

مشائخِ چشت سماع کو روحانی غذا سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن اس کے آداب کا نہایت سختی سے خیال رکھتے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ سماع کی چار قسمیں ہیں: حلال، حرام، مکروہ اور مباح۔ اگر صاحبِ وجد کو حق کی طرف زیادہ میل ہے تو سماع اس کے حق میں مباح ہے۔ اگر اس کا میلان مجاز کی طرف زیادہ ہے تو سماع اس کے حق میں مکروہ ہے، لیکن جس کا دل بالکل ہی مجاز کی طرف ہو اس کے لیے سماع حرام ہے۔ جب میلانِ طبع بالکل حق کی طرف ہو تو حلال ہے۔ (۹)

عموماً فارسی شعرا کا کلام ہی چشتی خانقاہوں میں سنا جاتا تھا۔ لیکن بعض اوقات مقامی زبان کے اشعار بھی محفلوں میں گرمی پیدا کر دیتے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ پر ہندی کی ایک 'جکری' سن کر وجد طاری ہو گیا تھا۔ سعدیؒ کے اشعار جب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی محفل میں پڑھے جاتے تھے تو اُن پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ فرماتے ہیں:

''اکثر مشائخ کی بہت سی نظمیں ہیں جن کے پڑھنے سے حال اور رقت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔'' (۱۰)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ شعر وشاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ امیر خسروؒ اور

Marfat.com

حسن سجزیؒ کی غزلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔اُن کی بارگاہ میں جا کر مرید دنیا کے جھگڑوں کو بھول کر اطمینانِ قلب حاصل کرتے تھے۔آپ کی خانقاہ میں آ کر امیر خسرو سکون حاصل کرتے تھے۔حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے عہد کی تہذیبی فضا میں اصولِ فقر نمایاں تھا۔امیر خسرو نے مالی آسودگی کے باوجود فقر اختیار کیا اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے وابستگی کے بعد بڑے مجاہدے کیے اور چالیس برس تک مسلسل روزہ دار رہے۔امیر خسرو نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی محبت کو اصلی دولت سمجھتے ہوئے اپنا مال راہِ حق میں خیرات کر دیا۔اُن کی طبیعت میں دنیا اور جاہ طلبی سے بے تعلقی اپنے پیر و مرشد کی وجہ سے آئی۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کا روحانی اثر بہت زیادہ تھا۔آپ کی خانقاہ لوگوں کے لیے جائے پناہ تھی۔نصف صدی سے زیادہ دہلی میں آپ کی خانقاہ ارشاد و تلقین کا مرکز اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔ملک کے گوشے گوشے سے لوگ پروانوں کی طرح وہاں جمع ہوتے تھے اور عشقِ الٰہی کی تپش اور خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر واپس جاتے تھے۔ہزاروں آدمی اُن کے لنگر سے کھانا کھاتے اور وہ خود مسلسل روزے رکھتے تھے اور سحری کے وقت اس خیال سے کھانا نہ کھاتے تھے کہ شہر میں کچھ لوگ بھوکے سو رہے ہوں گے۔(۱۱) خلق کی اس دردمندی نے انھیں اقلیمِ دل کا حکمران بنا دیا تھا۔کوئی شخص اپنی لڑکیوں کے رشتہ کی وجہ سے پریشان ہوتا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔کوئی سلطان کی بے التفاتی سے رنجیدہ خاطر ہوتا تو اُن سے عرضِ حال کرتا۔دل میں کوئی خلش ہوتی تو بے اختیار غیاث پور کی طرف قدم اٹھنے لگتے۔حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ ہر ایک کا دردوغم سنتے، اس کے زخموں پر مرہم لگاتے اور پھر بارگاہِ خداوندی میں ایک ایک کی تکلیف اپنے اوپر طاری کر کے دعا فرماتے۔(۱۲)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کو اُن کے مرشد بابا فرید گنجِ شکرؒ نے ایک شجرِ سایہ دار بننے کی دُعا دی تھی جس کے سایہ میں ایک خلقِ کثیر آسایش و راحت سے رہے۔تقریباً پچاس سال تک انسانی دلوں نے اس خانقاہ میں سکون حاصل کیا۔اُن کی خانقاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔اُن کی خانقاہ محبت اور دلنوازی کا مرکز بن گئی تھی۔اسی درگاہ کی عطا کردہ باطنی مستی نے امیر خسروؒ کو درگاہِ

Marfat.com

خواجہ میں محوِ رقص کر دیا۔ اسی درگاہ کے خواجہ نے امیر خسرو کو روح کے ارتقا کی اہمیت بتائی، قناعت اور بے نیازی سکھائی۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی وجہ سے دلّی علم، عقل اور عشق کا دبستان بن گیا۔ اس دبستان میں اہلِ نظر اور اہلِ اللہ کی دنیا ہے۔ اس دبستان میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی معنویت کا احساس بیدار کیا جاتا ہے، انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا جاتا ہے اور معاشرے کی اصلاح کا کام ہوتا ہے، مرید کو شیطانی اثر سے بچایا جاتا ہے اور اُسے اہلِ یقین میں تبدیل کر کے مجسم بندگی بنایا جاتا ہے اور پھر اُسے بامعنی زندگی دے کر جسم کی کیفیتوں سے آزاد کر کے خارج کے ساتھ متعارف کروایا جاتا ہے۔

ضیاء الدین برنی مصنف تاریخِ فیروز شاہی، حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔ شیخ کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اسی زمانے میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعتِ عام کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ وہ گناہگاروں کو خرقہ پہناتے تھے اور اُن سے توبہ کراتے تھے اور خود اپنے ارادے سے قبول کرتے تھے۔ ہر شخص کو خواہ خاص ہو یا عام، مالدار ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا متعلم، جاہل ہو یا شریف، بازاری ہو یا شہری، آزاد ہو یا غلام، ہر ایک کو طاقیہ عطا فرماتے، مسواک دیتے اور توبہ کراتے تھے اور سب لوگ چوں کہ اپنے آپ کو حضرت کا مُرید اور خدمت گار سمجھتے تھے اس لیے بہت سی ناکردنی باتوں سے پرہیز کرتے تھے اور اگر حضرت کے یہاں آنے والوں میں سے کسی سے لغزش ہو جاتی تھی تو وہ بیعت کی تجدید کر کے خرقہ لے لیتا تھا اور حضرت سے مرید ہونے کی شرم بہت سے لوگوں کو کھلّم کھلا یا چھپے چوری بہت سے منکرات کے ارتکاب سے بچاتی تھی اور خلقِ خدا عام طور پر تقلیداً اور اعتقاداً اطاعت اور عبادت کی طرف رغبت رکھتی تھی۔ خواص اور عوام کے دلوں میں نیکی اور نیکوکاری نے جگہ پکڑ لی تھی۔ مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بازاری عامی، غلام اور

Marfat.com

نوکر سب نماز ادا کرتے تھے۔ زیادہ تر مرید چاشت اور اشراق کے پابند ہو گئے تھے۔ شہر سے غیاث پورہ تک مختلف مقامات پر چبوترے بنائے گئے تھے، چھپر ڈال دیے گئے تھے، کنویں کھدوائے گئے تھے، پانی سے بھرے ہوئے مشکے اور مٹی کے لوٹے رکھے رہتے تھے، چٹائیاں بچھی رہتی تھیں، ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک حافظ اور ایک خادم مقرر کر دیا گیا تھا تاکہ مریدوں، توبہ کرنے والوں اور نیک لوگوں کو شیخ کے آستانہ تک آنے جانے میں نماز کے وقت وضو کرنے میں کوئی تردّد نہ ہو۔''(۱۳)

برنی کے والد نے چاہا کہ برنی کو سلطان المشائخ کی خدمت میں لے جائے تو بارگاہ کے بارے میں اظہارِ خیال اس طرح کرتا ہے:

''عجب بارگاہ ہے۔ روحانی پاکیزگی اور اخلاقی سربلندی کا مرکز۔ ملک میں آج ایسا کون ہے جو اس بارگاہ کی غلامی پر فخر نہیں کرتا۔ حضرت شیخؒ وہ بزرگ ہیں جن کی نگاہِ فیض سے دلوں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ شخصیتیں نکھر جاتی ہیں۔ کردار میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بارگاہ سے بہت کچھ حاصل ہوگا۔ بیٹا سچی بات یہ ہے کہ انسان بن جاؤ گے۔''(۱۴)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے فیوض و برکات سے عہدِ علائی ایک خوشگوار اور روحانی انقلاب سے آشنا ہوا تھا۔ برنی کے مشاہدے کے مطابق شیخ کے مرید ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ ظاہری اور باطنی گناہوں سے باز رہتے۔ شیخ کی دعائے خیر کا نتیجہ تھا کہ لوگ خلافِ شرع باتیں نہیں کرتے تھے۔ گفتگو کا محور مذہبی معاملات ہوتے تھے۔ خود سلطان علاءُ الدین اپنے خاندان سمیت حضرت کا بہت معتقد تھا۔ بادشاہ کے محل کے ملازمین بھی حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہو گئے تھے۔ لوگوں کے دل نیکی اور صداقت کی طرف مائل تھے۔ شہر کا کوئی ایسا محلّہ نہ تھا جہاں ہر مہینے یا بیسویں دن لوگ جمع ہو کر سماع میں شریک نہ ہوتے ہوں اور وجد کی حالت میں نالہ و بکا نہ کرتے ہوں۔ علاءُالدین کے عہد کے آخری دور میں تو یہ کیفیت تھی کہ بُری باتوں کو زبان

Marfat.com

پر نہ لایا جاتا اور امرا اور بڑے لوگ مذہبی کتابوں کے مطالعے میں مصروف نظر آتے اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوُّف اور حقائق کی کتابیں تلاش کیا کرتے تھے اور بقول برنی کوئی پگڑی ایسی نظر نہ آتی تھی جس میں مسواک اور کنگھا آویزاں نہ ہو اور چمڑے کے بنے ہوئے لوٹے اور برتن صوفی خریداروں کی کثرت کے سبب بہت گراں ہو گئے تھے۔ (۱۵)

شیخؒ کے نئے مرید قدیم مریدوں سے روزوں، نفلوں اور قلتِ غذا کے بارے میں معلوم کرتے رہتے۔ اس عہدِ خیر میں لوگ کثرت سے قرآن مجید حفظ کرنے کا اہتمام کرنے لگے تھے۔ نئے مرید پرانے مریدوں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے۔ پرانے مرید بندگی اور عبادت میں مصروف رہتے۔ ترک و تجرید پر عمل کرتے، سلوک کی کتابیں پڑھتے، مشائخ اور بزرگوں کے حالات و واقعات کے ذکر میں ہمہ وقت مصروف رہتے، دنیا اور دنیاداروں کا ذکر بھولے سے بھی اپنی زبان پر نہ لاتے۔ دنیا کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ایسی باتیں معیوب بلکہ گناہ میں شمار ہوتی تھیں۔ مسلمان سود اور ذخیرہ اندوزی سے تائب ہو گئے تھے۔ کسی بھی مسلمان کی زبان پر شراب و شاہد، فسق و فجور، قمار بازی یا فحش حرکات کا نام بھی نہیں آتا تھا۔ دکاندار چھل فریب، کم تولنے، دھوکے بازی اور سادہ لوحوں کی رقمیں مار لینے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ مکاری اور دغابازی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ (۱۶)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کا آستانہ روحانیت اور تجلیات کا مرکز تو تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑا زبردست دبستانِ علم و ادب بھی تھا۔ تاریخ، زبان، حدیث، فقہ، تجوید، فنِ شعر اور انشا سبھی پر گفتگو ہوتی۔ شہر کے ممتاز عالموں کا ایک پورا گروہ اس آستانے پر اکثر حاضر رہتا۔ اس گروہ میں ہر مکتبِ فکر کے علما شامل تھے۔ دبستانِ نظام میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی، خواجہ ضیاالدین برنی اور میر خورد جیسے یگانۂ روزگار اور رجحان ساز ادیب، شاعر، عالم اور مورخ موجود تھے۔ ان سب نے دبستانِ حضرت سلطان المشائخ میں تربیت پا کر شعر و ادب اور علم کی دنیا میں نئی راہوں اور نئے اسالیب کو رواج دیا۔ امیر خسروؒ نے حضرت والاؒ کے ارشادِ گرامی کے مطابق شعر میں صفاہانیوں کا انداز اختیار کر کے عشق انگیز اور زلف و خال کی آمیزش سے وہ رنگِ سخن اختیار کیا جس

Marfat.com

پر اہلِ سخن آج تک سر دھنتے ہیں۔ امیر حسن سجزیؒ نے حضرت کے فیضِ صحبت سے برصغیر میں ملفوظ نگاری کا آغاز کیا۔ خواجہ ضیاالدین برنی نے حضرت سلطان المشائخؒ کے روحانی اور علمی فیض سے تاریخ نگاری کا اسلوب وضع کیا۔ میر خورد نے دبستانِ نظامؒ کی روح پرور فضا میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے ''سیر الاولیا'' لکھ کر برصغیر میں سیرت نگاری کی روایت کا آغاز کیا۔ اس کتاب کو مرتب کر کے میر خورد نے حضرت سلطان المشائخ کی سیرت اور بارگاہ کا ایک بے نظیر مرقع پیش کیا۔ دبستانِ نظامؒ سے تربیت حاصل کر کے امیر خسروؒ، امیر حسن سجزیؒ، خواجہ ضیاالدین برنی، میر خورد اور دوسرے اہلِ قلم نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی ذات اور تعلیمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علم و ادب کو بے مثال فروغ بخشا۔ سبکِ ہندی کی انفرادیت، سیر و سوانح و تاریخ نگاری کی روایت، زبانِ ہندی کی نشو و نما اور موسیقی کی اثر انگیزی اور حلاوت یہ سب کچھ اسی دبستان کا عطیہ ہے۔ اس دبستان کی ہر شبیہ ایک یادگار تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔(۱۷) حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی جو اُن کی سماع سے دلچسپی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اُن کی اس جہت کو فروغ امیر خسروؒ سے حاصل ہوا۔ کلاسیکی موسیقی اور گیتوں میں ''خسرو نظام کے بل بل جاؤں'' سے لے کر ''نظام الدینؒ جگ اجیارو۔ جگت اجیارو'' اور اسی طرح کے دوسرے بول بکثرت گائے جاتے ہیں اور دبستانِ حضرت سلطان مشائخ کے عہد ساز اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔''(۱۸)

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی کوششوں سے چشتیہ سلسلہ کے اثرات اُن کے خلفاء کے ذریعے ہندوستان کے ہر حصے میں پہنچ گئے۔ صاحب گلزارِ ابرار نے لکھا ہے:

> ''ان ایام میں زمینِ ہند کو عجیب زمانہ حاصل تھا کیوں کہ آپ کی بارگاہِ خلافت سے وقتاً فوقتاً جو نئے نئے خلیفہ روانہ ہوتے تھے، اُن کی فیض پاشی سے ہند کا ہر مکان اور ہر قطعۂ زمین ہدایت آباد تھا۔ ایک روایت ہے کہ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مرتبے اور بڑی کرامتوں والے سات سو خلیفہ ایسے روانہ کیے تھے کہ ہر شخص کے سینے سے گویا عرفان کا آفتاب طلوع کرتا تھا۔''(۱۹)

Marfat.com

ضیاالدین برنی اور میر خورد نے شیخؒ کے اثرات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس کے پیشِ نظر خلفا کی سات سو کی تعداد نا قابلِ اعتبار نہیں معلوم ہوتی۔ چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام سے وابستہ رہ کر دہلی میں کام کرنے والے خلفا درج ذیل ہیں:

۱) مولانا شمس الدین یحییٰؒ
۲) شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ
۳) شیخ قطب الدین منورؒ
۴) مولانا حسام الدین ملتانیؒ
۵) مولانا فخرالدین زرادیؒ
۶) مولانا علاءالدین نیلیؒ
۷) مولانا وجیہہ الدین یوسفؒ
۸) مولانا سراج الدین عثمانؒ
۹) مولانا شہاب الدین امامؒ
۱۰) شیخ برہان الدین غریبؒ
۱۱) قاضی محی الدین کاشانیؒ
۱۲) خواجہ محمد امامؒ (۲۰)

شیخ یحییٰؒ کی وجہ سے سلسلہ کا علمی رعب اور وقار قائم ہوا۔ شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے بعد چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کو سنبھالا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ اور اُن کے تربیت کردہ اولیائے چشت کی خدمات کا دائرہ بنگال، دکن، گجرات، اودھ، دلی اور شمالی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مالوہ اور اس کے نواح میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مندرجہ ذیل خلفا کے ذریعے ہوئی:

۱) شیخ وجیہہ الدین یوسفؒ
۲) شیخ کمال الدینؒ

Marfat.com

۳) مولانا مغیث الدینؒ

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کتب خانے سے کتابیں لے کر شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراجؒ نے سرزمینِ بنگال پر نہ صرف سلسلۂ چشتیہ کی تنظیم کی، بلکہ بنگال میں چشتیہ سلسلہ کا پہلا کتب خانہ قائم کر کے بنگال میں اسلامی تہذیب وتمدن کی ترویج وتبلیغ کی۔ حضرت اخی سراجؒ اور اُن کے مریدین نے جمالِ ولایت سے اس مقام کو سجا دیا اور خلقِ خدا کی رہنمائی کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے روحانی اثرات کی نوعیت نظامِ اصلاح وتربیت سے وابستہ تھی۔ سماج کے فاسد عناصر کی اصلاح اور اس کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے کے لیے انھوں نے مؤثر طریقہ اختیار کیا اور تصوف کو عوامی تحریک بنا دیا۔

Marfat.com

حواشی

۱) پروفیسر جیلانی کامران ''امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک'' لاہور: جنگ پبلشرز، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۔
۲) فوائد الفواد بحوالہ ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ادارہ ادبیات دلی: ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۱۔
۳) ایضاً۔ ص ۳۲۲۔
۴) ایضاً۔ ص ۳۵۲۔
۵) ایضاً۔ ص ۳۶۲۔
۶) ایضاً۔ ص ۳۷۰۔
۷) ایضاً۔ ص ۳۷۲۔
۸) پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اول، ادارہ ادبیات، دلی: ۱۹۸۰ء، ص ۳۸۷۔
۹) میر خورد کرمانی ''سیر الاولیا'' اردو ترجمہ: غلام احمد بریاں، مسلم پریس، دلی: ۱۳۲۰ء، ص ۲۹۱۔
۱۰) فوائد الفواد بحوالہ ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اول، ص ۲۴۰۔
۱۱) سیر الاولیا۔ ص ۱۲۸۔
۱۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل، ص ۲۲۶۔
۱۳) ضیاالدین برنی ''تاریخِ فیروز شاہی'' مرتبہ سر سید احمد خاں، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ: ۱۸۶۰ء، ص ۳۴۳۔
۱۴) ڈاکٹر اسلم فرخی ''دبستانِ نظام'' لاہور: مکتبہ جدید پریس، طبع دوم: ۲۰۰۷ء، ص ۳۳۶، ۳۳۷۔
۱۵) تاریخِ فیروز شاہی بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا ''امیر خسرو'' لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔
۱۶) ڈاکٹر اسلم فرخی ''دبستانِ نظام'' طبع دوم، ص ۳۴۶، ۳۴۷۔
۱۷) ایضاً۔ ص ۳۔
۱۸) ایضاً۔ ص ۱۳۴۔
۱۹) پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل، ص ۲۲۹، ۲۳۰۔
۲۰) ایضاً۔ ص ۲۳۰۔

Marfat.com

تصوُّف: بیسویں صدی کے دانشوروں کی نظر میں

تصوُّف لغت میں اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے کا علم ہے۔ اسے علمِ فقیری اور صوفیہ کا مذہب بھی قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی سے قبل کے صوفیہ نے تصوُّف کا رشتہ دل کی صفائی سے جوڑا اور اسے دل کی نگہبانی کا کام سونپا۔ امام غزالیؒ نے تصوُّف کو عالمِ روحانی کی طرف کھلنے والا دروازہ کہا۔ (۱) تصوُّف دراصل ادب، اخلاق اور تہذیبِ نفس کا نام ہے۔ تصوُّف اخلاص، نظم وضبط، اور اخلاقی انقلاب ہے۔ تصوُّف ازلی دانش کا نام ہے۔ تصوُّف عمل کا ایک فلسفہ اور طرزِ حیات ہے۔ تصوُّف نفس کو عبودیت کے سانچے میں ڈھالنے اور اسے احکامِ ربوبیت کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ تصوُّف ہر اچھی عادت کو اپنانا اور بُری عادت کو ترک کرنا ہے۔ امر و نہی پر صبر کرتے ہوئے افعالِ حسنہ پر ثابت قدم رہنا ہی تصوُّف ہے۔ تصوُّف اپنے آپ کو پہچاننے اور باطن کے آئینہ کو صاف کر کے اس میں جلوۂ خدا دیکھنے کی شدید ترین آرزو کا نام ہے۔ عشق اور وجدان کے ذریعے اللہ سے رابطہ استوار کرنا تصوُّف ہے۔ تصوُّف دیدارِ ذات کا وسیلہ اور بقول الف۔ د۔ نسیم خدا کے حصول کی عملی شکل ہے۔ (۲)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی تصوُّف کے بارے میں کہتے ہیں:

''تصوُّف اُس اشتیاق کا نام ہے جو ایک صوفی کے دل و دماغ میں خدا سے ملنے کے لیے اس شدت کے ساتھ موجزن ہوتا ہے کہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آ جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صوفی خدا کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔ گفتگو کرتا ہے تو اسی کی، خیال کرتا ہے تو اُسی کا، یاد کرتا ہے تو اسی کو، کلمہ پڑھتا ہے تو اُسی کا، شفق کی سرخی میں،

Marfat.com

دریا کی روانی میں، پھولوں کی مہک میں، بلبل کی آواز میں، تاروں کی
چمک میں، صحرا کی وسعت میں، باغ کی شادابی میں، غرض کہ تمام مظاہرِ
فطرت اور مناظرِ قدرت میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔''(۳)

جیلانی کامران تصوُّف کو خالص مسلمانوں کی شے سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تصوُّف کے آداب اُنہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ علمِ تصوُّف کی تاریخ ہمارے لیے ایک طے شدہ صداقت ہے۔ تصوُّف باطن کو آزاد کرنے کے اثباتی فکر کی پہلی منزل ہے۔ تصوُّف نے انسان کی سائیکالوجی میں اُتر کر خواب و رویا، القا، مکاشفات اور وصل و وحدت کے مختلف ذریعوں سے انسان کے باطن میں روشنی کرنے کا اہتمام کیا۔ تصوُّف نے اس زمین پر انسان کو قلب و ذہن کے ساتھ آباد کیا اور کائنات کی نشانیوں کے کھلنے اور کھل جانے کے امکانات پیدا کیے۔ اس اعتبار سے تصوُّف مسلمانوں کی جانب سے انسانیت کو سونپا ہوا ایک منفرد اور بیش قیمت تحفہ تھا۔ (۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تصوُّف کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ پہلے توڑا جائے اور پھر ایک بلند تر سطح پر اسے دوبارہ جوڑ دیا جائے۔ عام زندگی رشتوں سے عبارت ہے۔ انسان ان رشتوں کو ازلی و ابدی قرار دیتا ہے مگر تصوُّف اس خیال کو deconstruct کرتا ہے مثلاً وہ ''موجود اور عدم'' کی دوئی کو الٹ دیتا ہے۔ عام انسانی رویہ تو اس موجود کو حقیقی اور اصل سمجھتا ہے جس کا ادراک اسے اپنی پانچوں حسیات کے ذریعے ہوتا ہے اور اس کے باہر جو کچھ ہے اسے ''عدم'' قرار دیتا ہے۔ تصوُّف اس تصور کو توڑتا ہے اور کہتا ہے کہ حسیات کی گرفت میں آئی ہوئی کائنات جو کثرت کی مظہر، وقت کے تسلسل کی زد پر اور ایک مسلسل تغیر کی حامل ہے، محض فریبِ نظر یا سراب ہے۔ اصل کائنات تو رنگوں، خوشبوؤں اور آوازوں کی اس دنیا سے ماورا ایک بے کنار ''اکائی'' ہے جو تغیر، کثرت اور تسلسل سے ناآشنا ہے۔ یوں تصوُّف ''موجود'' کے بارے میں انسان کے مروّج رویے کو deconstruct کرتا ہے۔ وہ ہست کو منہدم نہیں کرتا بلکہ ہست کے اس رُخ سے جو construction کا روپ ہے انسان کی نظروں کو منقطع کر کے انھیں اس رُخ پر مرکوز کر دیتا ہے جو being کا روپ ہے اور یوں being کو becoming کے روبرو لا کر کائنات کا ایک نیا بُعد سامنے لے آتا ہے۔ (۵)

Marfat.com

ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے میں تصوُّف کا ظاہری حلیے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق شعور واحساس سے ہے۔فرماتے ہیں:

''ذاتِ احد کی یکتائی کا کامل شعور واحساس ہی تصوُّف کا دوسرا نام ہے۔ یہ نام ہے جملہ اعتبارات کا، ذاتِ احدیت میں گم ہو جانے کا۔ یہ پشمینہ پوشی، موتراشی اور کلاہ آرائی کا نام نہیں۔''(٦)

ڈاکٹر محمد شریف سیالوی کے نزدیک تصوُّف دینِ اسلام کی ایک صحیح اور مکمل تعبیر ہے۔ وہ تصوُّف کو روحِ دین کہتے ہیں اور باعمل عالم کو صوفی، جس کا ہر فعل اخلاص پر مبنی ہوتا ہے۔(٧)

پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک نے تصوُّف کو امتِ مسلمہ کی طاقت ور غذا (tonic) کہا ہے اور تصوُّف کی بنیاد غور وفکر اور commitment کو بتایا ہے۔ وہ تصوُّف کا بنیادی اصول یہ بتاتے ہیں کہ مخلوق کی طرف سے نظر چرائی جائے اور صرف اللہ کریم کی طرف ہر لحظہ توجہ مرکوز رکھی جائے۔(٨)

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی لکھتے ہیں کہ صوفیہ کا دعویٰ بھی ہے اور یقین بھی کہ تصوُّف داخل کی اصلاح، باطن کی تہذیب اور خارج وظاہر کی تربیت کا کفیل ادارہ ہے۔اس سے وہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں جو مادّی یلغار اور نفسانی خواہشات کے دباؤ کی وجہ سے مضمحل ہو جاتی ہیں۔ یہ قوتیں داخل کو قوی اور ظاہر کو آداب آشنا بناتی ہیں۔تصوُّف کے ضوابط، اندازِ اخذ وترک اور طریقِ اصلاح کے ذریعے صفائے قلب کی روشنی اعضاء وجوارح کے اعمال میں منعکس ہوتی ہے، جس سے باطن اور ظاہر کی یک رنگی کی نمود ہوتی ہے اور انسان ایک یکسانی کا مظہر قرار پاتا ہے۔اس سے ملّی وحدت کو بھی فروغ ملتا ہے اور اصلاحِ بشر کی تحریکوں میں قربت کا احساس بھی ابھرتا ہے(٩)۔

تصوُّف ''تلاشِ احسن'' اور ''جستجوئے احسان'' کی وہ ہمہ گیر تحریک ہے جس کا مقصود عبادات میں حسن کی تلاش ہے، یہ ہرگز ترکِ عبادت نہیں، یہ تو ظاہری اعمال کے حُسن کے ساتھ مقصدِ اعمال تک رسائی کا نام ہے۔اس میں اسلامی تعلیمات سے بغاوت نہیں بلکہ ان کی پاسداری کا عزم موجود ہے۔(١٠)

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ توحید اور انسان دوستی کے مطالب تصوُّف کو

Marfat.com

ہرانسان کے لیے اہم اور ہر معاشرے کے لیے مفید بناتے ہیں۔صوفیہ کے توحیدِ خالص، حسنِ خلق اور انسان دوستی کے تصورات میں انسان کی آخرت اور دنیا دونوں کی بھلائی ہے۔توحیدِ خالص کو اختیار کرنے سے انسان مومنِ صادق بن جاتا ہے، یوں اس کی آخرت سنور جاتی ہے۔انسان دوستی کا رویّہ اپنانے سے وہ معاشرے کا اچھا، معتبر اور مفید فرد بن جاتا ہے، یوں اس کی دنیا سنور جاتی ہے۔ایک درویش کا قول ہے کہ اگر دوزخ سے رہائی چاہتے ہوتو خدمتِ خلق کرو اور اگر جنت حاصل کرنا چاہتے ہوتو عبادتِ حق کرو۔ یہ حقائق تصوُّف کی عالمگیر اہمیت اور اس کی ضرورت کو آنے والی صدیوں میں بھی ثابت و مسلّم کرتے ہیں۔ (۱۱)

جدید دور کے معاشرتی تقاضوں اور ہنگاموں میں گھرا ہوا انسان عام طور پر خود کو، خدا کو اور انسانیت کو بھلا چکا ہے۔سو، سکونِ قلب اور طمانیتِ روح سے محروم ہوتا جارہا ہے۔تصوُّف اس انسان کے کام آسکتا ہے۔اس دنیا کے ہنگاموں میں مصروف انسان کو بھی سکون وطمانیتِ قلب کی دولت سے مالا مال کرسکتا ہے۔ (۱۲)

تصوُّف درحقیقت انسان کا خود کو خدا کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے۔خدا کے رنگ میں رنگے جانے سے انسان کی زندگی نور میں ڈھل جاتی ہے، اس کی گفتار حق وصداقت کا معیار، اس کا کردار ہدایت ورحمت کا سرچشمہ اور اس کی شخصیت اہلِ جہاں کے لیے روشنی کا مینار بن جاتی ہے اور اس کی دعا ہوتی ہے، اے اللہ! ایسی دانائی دے کہ ہم راہِ حق کو جان جائیں اور ایسی بینائی دے کہ راہِ حق سے گمراہ نہ ہوں، ایسا دل دے کہ جس سے باطل کے سامنے ڈٹ جائیں اور حق کے لیے جان تک قربان کردیں اور ایسی جان دے کہ جس سے اہلِ جہان کے کام سنواریں۔ (۱۳)

سید احمد سعید ہمدانی (مذہبی ریسرچ سکالر) نے تصوُّف کو ''قلبِ اسلام'' کہا ہے اور لکھتے ہیں:

> ''تصوُّف دراصل علومِ اسلامیہ ہی کا ایک شعبہ ہے جس میں بنیادی طور پر اخلاقی اور روحانی تعلیم وتربیت کو اہمیت حاصل ہے۔'' (۱۴)

اگر حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی نے علمِ تصوُّف کو چشمۂ شریعت سے نکلی ہوئی نہر اور تصوُّف کو احکامِ شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ کہا ہے تو ڈاکٹر طاہر رضا بخاری نے تصوُّف کو

Marfat.com

منشائے شریعت کی تکمیل کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شریعت اور تصوُّف کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ اتباعِ رسولؐ جب تک ظواہر تک محدود رہے تو اس کا نام دین و شریعت ہے اور جب قلب و باطن بھی نورانیتِ رسولؐ سے منور ہو جائے تو یہ تصوُّف و طریقت ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے کہ کوئی شخص اگر کتبِ حدیث و فقہ میں درج قواعد کے مطابق نماز پڑھ لے تو شریعت کی رُو سے اس کی نماز مکمل ہوگئی، مگر تصوُّف اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ نماز میں جس طرح چہرہ کعبہ کی طرف متوجہ رہا ہے اسی طرح دل بھی ربِّ کعبہ کی جانب متوجہ رہے، جس طرح جسم حالتِ نماز میں ظاہری نجاستوں سے پاک رہا اسی طرح روح بھی باطنی آلایشوں سے پاک رہے، جتنا لباس کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے اتنا ہی دل کا بھی تمام خیالاتِ دنیا سے پاک وصاف ہونا لازم ہے۔''(۱۵)

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری تصوُّف کے تین مقاصد بتاتے ہیں:

۱) تزکیۂ نفس

۲) تصفیۂ قلب

۳) معرفتِ ربانی

آگے لکھتے ہیں کہ شریعت میں ان تینوں امور کی جو اہمیت و افادیت ہے اس سے ہر ذی شعور مسلمان آگاہ ہے۔ تزکیۂ نفس کے بغیر کتاب و حکمت کی تعلیم مؤثر نہیں ہو سکتی اور تزکیۂ نفس کا حصول راہِ سلوک پر چلے بغیر ناممکن حد تک مشکل ہے۔ صوفی نہ صرف گناہوں کو ترک کرتا ہے بلکہ ان جڑوں تک کو تلاش کر کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال باہر پھینکتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں، ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں گھر بنانا چاہتی ہے، خواہشات بسا اوقات رذائل کو فضائل کی شکل میں پیش کرتی ہیں، لیکن ایک صوفی ایمان و اخلاص کے سہارے نفس و شیطان کے جال سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس راہ میں بڑی آزمایشوں سے گزرنا پڑتا ہے اور سخت ریاضت و

Marfat.com

جانفشانی سے کام لینا ہوتا ہے۔ اللہ کی حضوری و معیت کا تصور اس کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہی شریعت کا مقصود ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان کا مطمحِ نظر آخرت ہو، وہ دنیا میں بھرپور زندگی گزارتے ہوئے اپنے دامن کو دنیاوی آلایشوں سے بچا کر راہِ آخرت کا راہی ہو۔ یہی تصوُّف کا مقصود و مطلوب ہے۔ (۱۶)

عصرِ حاضر میں تصوُّف کی تعبیر و تفسیر کے سلسلے میں پروفیسر احمد رفیق اختر کا نام بہت مستند و معتبر گردانا جاتا ہے۔ بقول افتخار عارف ''تصوُّف کی روایت کو توہمات و کرامات کے منطقوں سے نکال کر دلیل و دانش سے جوڑ دینا پروفیسر احمد رفیق اختر کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ان کے لیے ہی نہیں، ان کے ہم نشینوں کے لیے بھی سبب طمانیت و امتیاز ٹھہرتا ہے۔'' (۱۷)

پروفیسر احمد رفیق اختر تصوُّف کو ''مذہب میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ سند'' کہتے ہیں۔ (۱۸) وہ تصوُّف کی بڑی سادہ سی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ''جس شخص نے مناسب عمر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں فلسفۂ ترجیحات پہ غور کروں گا اور میری زندگی کی اوّلین ترجیح میرا رب ہے تو وہ صوفی ہے۔'' (۱۹)

تصوُّف اور دیگر علوم میں فرق بتاتے ہوئے پروفیسر احمد رفیق اختر لکھتے ہیں کہ تصوُّف میں اور دیگر علوم میں ایک بنیادی فرق ہے کہ یہ علوم آپ سے کردار کا تقاضا نہیں کرتے۔ علوم آپ سے یہ نہیں کہیں گے کہ جب تک آپ نیک اور پرہیز گار نہیں ہوں گے، جب تک پانچ وقت نماز نہیں پڑھیں گے، جب تک آپ روزہ نہیں رکھو گے، اُس وقت تک ہم آپ کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری نہیں دے سکتے۔ آپ پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی نہیں سکتے۔ دنیا کی کوئی یونیورسٹی یہ معیار نہیں رکھتی۔ کوئی کردار سازی کو علم کا حصہ نہیں بناتا، اور دوسری بات آپ کے ذاتی جذبات کا اثر آپ کے تجربات پر نہیں ہوتا۔ آپ چاہے آنکھوں سے آنسو گرا رہے ہوں، اداس ہوں مگر آپ کے اجزاء وہی نتیجہ دکھائیں گے جو انھوں نے دکھانا ہوتا ہے۔ مگر تصوُّف میں ایک ذرا سی لغزشِ خیال آپ کے نتیجے کو بدل دے گی۔ تصوُّف وہ علم ہے جس میں ذرا سا جلی اور خفی تکبر آپ کے نتائج بدل دیتا ہے۔ ایک جھوٹ آپ کے نتائج مسخ کر دیتا ہے۔ قلبِ ویران کی ایک کیفیت زمین و آسمان کے نقشے بدل دیتی ہے۔ یہ کیسی سائنس ہے کہ جس میں تحقیق و جستجو کی بے انتہا غایتوں کے باوجود آپ کو کچھ اور بھی ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس سائنس میں انسان کے متغیر نفس کا وجود

Marfat.com

نا قابلِ برداشت ہے۔تصوُّف جذبات کی سائنس ہے۔نفسیات ایک بدتر نفس کو بہتر نفس میں ڈھال دیتی ہے لیکن وہ بندے کو خدا تک نہیں پہنچا سکتی۔ جہاں بھی نفسیات کی آخری حدود شروع ہوتی ہیں وہاں سے تصوُّف کا ابتدائی قدم اٹھتا ہے۔(۲۰)

پروفیسر صاحب کے مطابق تصوُّف یقیناً ایمان کی ایک جہت ہے اور ایک سادہ ترین انسان بھی صوفی ہوسکتا ہے، خدا کا شعور رکھ سکتا ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر تصوُّف میں اخلاص کو اہم سمجھتے ہیں۔خلوصِ قلب کے سلسلے میں مثنوی میں مولانا رومؒ نے ایک گڈریے کا واقعہ بیان کیا ہے:

> ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک گڈریے نے اللہ سے مناجات کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ تو اگر مل جائے تو میں تیرا نوکر بن جاؤں، تیرے جوتے گانٹھوں، تیرے بالوں میں کنگھی کروں، تیرے کپڑے دھوؤں، تیری جوئیں ماروں، تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں..... موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر سخت برہم ہوئے، اس کو سخت ست الفاظ سے یاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحی آئی کہ یہ میرا مقبول بندہ ہے اسے کچھ نہ کہو۔''

تصوُّف میں عبادت کا فلسفہ ہی نرالا ہے۔تصوُّف میں عبادات کی روح کا خیال رکھا جاتا ہے۔عابد کا خلوصِ قلب زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک تصوُّف کاٹ چھانٹ کا نام ہے اور جس نے نفس کے ساتھ ہمدردی کی وہ تصوُّف کے علم کا ایک ذرّہ بھی نہیں حاصل کرسکتا(۲۱) اور جس کا پہلا قدم اللہ کی راہ میں اٹھتا ہے، خدا اسے پہلے قدم سے پہلے آن لیتا ہے۔(۲۲)

تصوُّف میں خدا کی حمایت میں نفس کے خلاف ارتکاز ہوتا ہے۔صوفی خدا کے حق میں نفس کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور باقی تمام علوم کے ارتکاز میں لوگ اپنے حق میں نفس کے ارتکاز میں جاتے ہیں(۲۳) سارے علوم کے دھارے خدا کی ذات سے نکلتے ہیں جو اُس کا ہوگیا وہ گویا علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔(۲۴)

پروفیسر احمد رفیق اختر کے نزدیک مشاہداتِ ربانی کی طرف پیش رفت کرنا تصوُّف

Marfat.com

ہے(۲۵) اُن کے نزدیک تمام انسان صوفی ہو سکتے ہیں۔ تصوُّف کوئی غیر معمولی ہونا نہیں بلکہ تصوُّف نارمل ہونے کا نام ہے۔ تصوُّف اللہ کے توسط سے اپنی بے محابا حیوانی جبلتوں کو اعتدال میں لانے اور خدا کے احکامات کے تحت حدود اللہ سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ تصوُّف باطن اور ظاہر دونوں خطاؤں سے ذہناً اور بدناً بچنے کا نام ہے۔ اس لیے جب مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ طریقت کیا ہے اور شریعت کیا ہے، تو میں ان سے کہتا ہوں کہ طریقت شریعت کی نیت ہے(۲۶)۔ صوفی کے نفس میں تغیر نہیں آنا چاہیے۔ وہ واحد ایسا شخص ہے جو خارجی بحران سے لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی عریانیت اور احساسِ کمتری کا بھی مطالعہ کرتا ہے۔ وہ محرومیوں کے سیلاب سے بھی گزرتا ہے مگر اپنے ہی سیلف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نفی اور اس کا بطلان کرتا ہے۔ وہ خداوند کریم اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں بڑھتا ہوا، اعمالِ صالح کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر ایک فکر مسلسل کے ساتھ اپنی ہر اندرونی کمزوری کا سامنا کرتے ہوئے ہر روز مرتا ہے۔ اگر وہ ہر روز نہ مرتا تو وہ بڑا مجاہد نہیں ہو سکتا تھا۔ صوفی کو پتا ہے کہ میں نے ہر حال میں ہر رنگ میں اپنے آپ کو قتل کرنا ہے۔ ہمارے صوفی کی تعریف یہی ہے کہ وہ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو بڑھتا ہے۔ دنیاوی جدوجہد میں توازن تخلیق کرنے کے بعد ایک باطنی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اس آیت پر عمل کرتا ہے کہ خارجی گناہوں سے بھی بچو اور باطنی گناہوں سے بھی بچو۔ (۲۷)

تصوُّف اپنی ذات کے خلاف عمل کرنے کا نام ہے۔ اس میں اپنے نفس کے خلاف جانا پڑتا ہے۔ ایک خصوصی تہذیبِ نفس سے آگہی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ (۲۸)

تصوُّف خدا کو شاید بصارت سے نہیں دیکھتا، مگر اس کی بصیرت میں عام آثار موجود ہوتے ہیں اسی لیے حدیثِ رسولؐ ہے کہ فراستِ مومن سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (۲۹)

قدیم کو حادث سے علیحدہ کرنا توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی قدیم نہیں اور پوری کائنات حادث ہے۔ ہر شے اور ہر وجود حادث ہے۔ اگر کوئی قدیم ہے تو وہ اللہ ہے۔ تصوُّف اس قدیم کو حادث سے الگ کرنے کا نام ہے۔ (۳۰) تصوُّف کسی انسان کی arrangement of priorities کو کہتے ہیں۔ زندگی کی ترجیحات کو منقسم کرنے کا نام تصوُّف ہے۔ (۳۱) علم

Marfat.com

تصوُّف کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام صوفیہ صاحبِ علم ہوتے ہیں۔تمام علماء عارف نہیں ہوتے مگر تمام صوفی صاحبِ علم ہوتے ہیں۔خدا کو جاننے کی ایک بنیادی شرط علم ہے۔(۳۲)

اگر اس کائنات میں آسان ترین تحصیل ممکن ہے تو وہ خدا کی ہے۔صوفی کا پہلا اور آخر مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ عقل کی نعمت بروئے کار لا کر اپنے خدا کو پہچانے، personal relationship اللہ اور بندے کے درمیان قائم ہوتا ہے۔(۳۳)

Sciences اور تصوُّف میں ایک بہت بنیادی فرق ہے۔sciences جس چیز سے deal کرتی ہیں، صوفی اس چیز سے deal نہیں کرتا۔صوفی حقائق کی تلاش میں ہوتا ہے اور سائنسدان relationship کی تلاش میں ہوتا ہے۔یہ بہت بڑا فرق ہے۔مشہور فلاسفر رسل (Russel) کہتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں، ہم اشیاء کی فطرت نہیں جانتے۔ اس کے برعکس صوفی فطرت کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔(۳۴)

صوفیہ عام انسان سے زیادہ محنت کرتے ہیں کیوں کہ تصوُّف عمومیت سے خصوصیت کی طرف لے جاتا ہے (۳۵) اور خصوصیت یہ ہے کہ صوفی کے نزدیک اللہ کی یاد سے بڑی بات کوئی نہیں۔اللہ نے انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس تخلیق کیا ہے۔اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنے ہی نفس کے گلے پر چھری پھیرنی ہوتی ہے اس لیے کائنات میں سب سے بڑا مشکل کام خدا کی آرزو کرنا ہے۔جب تک نفس کو عزیز چیزوں کی قربانی نہ دی جائے، کامیابی ملنا ممکن نہیں۔خدا کسی صورت میں ثانوی حیثیت قبول نہیں کرتا۔پروفیسر احمد رفیق اختر کہتے ہیں کہ لوگ تصوُّف کو مشکل سمجھتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ تصوُّف کے بغیر زندگی کا اور کوئی قرینہ ہی نہیں ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ شناخت پر ہمارا حق ہے۔(۳۶) خدا کی شناخت اور آگاہی کے لیے اپنے آپ کو یعنی self کو پہچاننا ہوگا۔حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس کو اللہ اپنا علم دینا چاہتا ہے، اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔درونِ کائنات سمجھنے کے لیے inner computers کا سمجھا جانا بہت ضروری ہے۔جسمانی اور physical اذیت میں خدا نہیں ملتا بلکہ عرفان اعتدال میں ہے۔

مولوی اور صوفی میں سب سے بڑا clash یہ ہے کہ صوفی برداشت کرتا ہے۔اللہ کا ولی لوگوں کی خطاؤں کو برداشت کرتا ہے، سمیٹتا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ صوفی جانتا

Marfat.com

ہے کہ اللہ کی رحمت کا منصب انسانوں کے تمام گناہوں سے بڑا ہے جب کہ مولوی سختی سے خوف کی تمام حجتیں مہیا کرتا ہے اور مسلمان کو خوف کا شکار بنا دیتا ہے۔ (۳۷)

اس شخص کو صوفی نہیں مانا جا سکتا ہے جس نے تلاشِ علم اور تکمیلِ علم نہ کی ہو اور جو شناختِ وجود اور شناختِ غیب نہ رکھتا ہے۔ (۳۸)

تصوُّف وہ تحریک ہے جس میں اچھی طرح خدا کو جاننے کے بعد آپ اس کے قرب اور ہمسائیگی کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور پہلا قدم دلیل ہے یعنی ذہن کا پوری طرح صاف ہونا۔ قرآن اسے علم الیقین کہتا ہے۔ اللہ کو اوّل ترجیح مان کر اس کے رستے میں آنے والی مشکلات کے ساتھ رہنا۔ سب سے بڑی مشکل انسان کی انا، خواہشاتِ نفس، ترددات اور احساسات ہیں۔ تجسس اور افسانوی خیالات رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ ان رستوں پر آپ اللہ کی نشانیاں دیکھتے ہیں۔ اسباب کو منقطع کر کے پروردگار اکیلے ہی آپ کو صرف اپنے وجود کی دلیل مستحکم کرتا جاتا ہے، اس کو ہم عین الیقین کہتے ہیں۔ مشاہدے سے بیزار ہونے پر حق الیقین کا مرحلہ آتا ہے۔ اس سطح پر آ کر خدا وصال سے محسوس نہیں ہوتا، فراق سے محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ کے ساتھ ہوگا، آپ نارمل ہوں گے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں ہوگا، آپ بے چینی محسوس کریں گے۔ (۳۹)

ملکہ سبا نے کہا کہ بادشاہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے اجاڑ اور ویران کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا بالکل اسی طرح اللہ جس جسم میں داخل ہوتا ہے، اس کو پہلے تباہ و برباد کرتا ہے اور دل میں خواہشات اور آرزوؤں کے جو بڑے بڑے امراء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سر نیچے کر دیتا ہے۔ جب وہ اس بستی کو اچھی طرح اجاڑ لیتا ہے تو خود آپ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ بستی از سرِ نو آباد ہوتی ہے۔ پہلے اس تعمیر کو ویران کرتے ہیں، پھر اس تعمیر کو دوبارہ استوار کرتے ہیں۔ یہی کارِ تصوُّف ہے۔ یہی اللہ کا طریق ہے لیکن اس میں کوئی غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ (۴۰)

جو شخص حواسِ خمسہ سے ذرا سا آگے گزر گیا، وہ اللہ کو پا لیتا ہے۔ حواسِ خمسہ جعلی ہیں یہ پابندی کے حواس ہیں۔ یہ صرف وقتی طور پر زمین پر اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے دیئے گئے ہیں۔ اس زمین سے اوپر گلیکسیز میں، ٹاپ خلا میں چلے جائیں، یہ سارے حواس ختم ہو جاتے ہیں، وزن اور

Marfat.com

ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حواس حجاب ہیں اور اللہ اس حجاب سے آگے بستا ہے۔(۴۱) حواسِ خمسہ سے آگے گزرتے ہوئے ایک ریفائن ادراک کو ہم اللہ کی محبت کہتے ہیں۔ جب تک ہم حواسِ خمسہ کی گرفت میں رہتے ہیں، ہم پر شرع غالب ہوتی ہے اور جب ذرا آگے intellectual refinement میں جاتے ہیں تو پھر ہمیں اللہ بڑے واضح طور پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔(۴۲) بات جب پانچ حواس سے آگے جاتی ہے تو خدا کا احساس قریب تر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ذہانت، علم اور دانش ہے جس سے انسان اللہ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔ جبلت خدا کی حریف ہے اور عقل و معرفت خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہی شناختِ ذات کے لیے ہے۔ دانشورانہ استعداد کی سب سے بڑی خصوصیت ہی خدا کا جاننا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔(۴۳)

تصوُّف علوم ذات اور اپنی ذات کی سائیکاٹری سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں دورِ حاضر کی نفسیات ختم ہوتی ہے، صوفی کا ادراک وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نفسیات ایک کمتر سیلف کو بہتر سیلف میں ڈال دیتی ہے۔ ایک مجبور و مقہور اور گھٹی ہوئی ذات کو کارآمد بنا کر سوشل کر دیتی ہے مگر اس کے پاس یہ ٹاسک نہیں ہے کہ وہ سیلف کو سرنڈر کر کے قوم کی خدمت کا تصور دے۔ صوفیہ اپنے زمانے کے مکمل انٹلکچوئل ہیں اور اپنے زمانے کی انٹلکچوئل سطح سے گزر کر خدا کو پہنچتے ہیں۔(۴۴)

جس کو خدا کی تلاش ہے، اس کو اسلام کی تلاش ہے۔ جس کو اسلام کی تلاش ہے، وہ اللہ کے رستے پر محمد رسول اللہؐ کے بغیر کبھی نہیں پہنچ سکتا۔(۴۵)

قدیم صوفیہ اور جدید دانشوروں کے تصوُّف کی اساس ایک ہی ہے۔ وہاں بھی خدمتِ خلق اور انسان دوستی کی اہمیت ہے اور یہاں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ وہاں بھی تصوُّف اور شریعت میں کوئی دوری نہیں یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ عشقِ رسولؐ کے بغیر خدا تک رسائی پہلے بھی ناممکن تھی اور اب بھی ناممکن ہے۔ نفس کی مخالفت قدیم صوفیہ نے بھی کی اور نفس کو تسخیر کرنا اب بھی ضروری سمجھا گیا۔ اعتدال اور اخلاص کو ضروری پہلے بھی گردانا گیا اور اس کی تلقین جدید دانشور بھی کرتے ہیں۔ خدا کی تلاش اور اس کے قرب کی خواہش پہلے بھی موجود تھی اور آج بھی ہے۔

Marfat.com

شایداس لیے کہ ہمارے شعور کی گہرائیوں میں کہیں میثاق کا عہد اور وژن باقی ہے۔کوئی دور بھی خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔

Marfat.com

حواشی

۱) امام غزالیؒ۔ ''کیمیائے سعادت''، مترجم، محمد سعید الرحمٰن علوی، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۔
۲) اللہ دتا نسیم۔ ''اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر'' مقالہ پی ایچ ڈی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۹۔
۳) پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ ''مقدمہ تاریخِ تصوُّف''، لاہور: دارالکتاب۔ ص ۱، ۳۔
۴) جیلانی کامران۔ ''ہمارا ادبی اور فکری سفر''۔ لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱، ۳۲، ۱۶۶، ۱۶۹۔
۵) ڈاکٹر وزیر آغا۔ ''تنقید اور جدید اُردو تنقید''، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پہلی بار: دسمبر ۹۸ء، ص ۱۰۶۔
۶) ڈاکٹر تحسین فراقی، مضمون ''اقبال اور تصوُّف'' چند تاثرات مشمولہ کتاب ''اقبال اور تصوُّف'' مصنف محمد شریف بقا۔ لاہور: جنگ پبلشرز، اشاعت اوّل، ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۹۔
۷) مجلّہ ''معارفِ اولیاء''۔ لاہور: مرکز معارفِ اولیاء، ایڈیشن: اوّل۔ جلد ۶، شمارہ ۳، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۷، ۱۸۔
۸) مذکورہ حوالہ۔ ص ۳۷، ۴۷، ۴۸۔
۹) مذکورہ حوالہ۔ ص ۶۱، ۶۲۔
۱۰) مذکورہ حوالہ۔ ص ۶۲۔
۱۱) پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ ابتدائیہ ''تصوُّف اور تصوراتِ صوفیہ''۔ لاہور: سیٹھی بکس، ۲۰۰۸ء، ص X۔
۱۲) مذکورہ حوالہ، ص xiii۔
۱۳) مذکورہ حوالہ، ص ۴۷۷۔
۱۴) معارفِ اولیاء۔ جلد: ۶، شمارہ: ۳، ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۱۳۵۔
۱۵) مذکورہ حوالہ۔ ص ۱۰۸۔
۱۶) مذکورہ حوالہ۔ ص ۱۱۵۔
۱۷) افتخار عارف کا خلاصہ بصورتِ فلیپ ''پسِ حجاب'' سے مشمولہ ''حقیقتِ مُنتظر'' مصنف پروفیسر احمد رفیق اختر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔ ص ۲۸۷۔
۱۸) پروفیسر احمد رفیق اختر ''حقیقتِ مُنتظر'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔ ص ۱۹۔

Marfat.com

۱۹) مذکورہ حوالہ۔ص۹۵۔
۲۰) مذکورہ حوالہ۔ص۱۰۰-۱۰۱۔
۲۱) مذکورہ حوالہ۔ص۱۱۱۔
۲۲) مذکورہ حوالہ۔ص۱۲۷۔
۲۳) مذکورہ حوالہ۔ص۱۳۰-۱۳۱۔
۲۴) مذکورہ حوالہ۔ص۲۸۶۔
۲۵) پروفیسر احمد رفیق اختر ''اُٹھتے ہیں حجاب آخر''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص۴۳۔
۲۶) مذکورہ حوالہ۔ص۶۸۔
۲۷) مذکورہ حوالہ۔ص۱۰۳-۱۰۴۔
۲۸) مذکورہ حوالہ۔ص۱۰۶-۱۰۷۔
۲۹) مذکورہ حوالہ۔ص۱۶۰۔
۳۰) پروفیسر احمد رفیق اختر ''اسلام اور عصرِ حاضر''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۷۰۔
۳۱) مذکورہ حوالہ۔ص۷۱۔
۳۲) مذکورہ حوالہ۔ص۷۲۔
۳۳) مذکورہ حوالہ۔ص۷۴۔
۳۴) مذکورہ حوالہ۔ص۸۵-۸۶۔
۳۵) مذکورہ حوالہ۔ص۹۸۔
۳۶) مذکورہ حوالہ۔ص۲۰۰۔
۳۷) مذکورہ حوالہ۔ص۲۱۶۔
۳۸) مذکورہ حوالہ۔ص۲۲۳۔
۳۹) پروفیسر احمد رفیق اختر ''پسِ حجاب''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۹۔
۴۰) مذکورہ حوالہ۔ص۹-۱۰۔
۴۱) مذکورہ حوالہ۔ص۱۹۔
۴۲) مذکورہ حوالہ۔ص۲۲۔
۴۳) مذکورہ حوالہ۔ص۳۷۔
۴۴) مذکورہ حوالہ۔ص۹۵۔
۴۵) مذکورہ حوالہ۔ص۱۴۷-۱۴۸۔
۴۶) مذکورہ حوالہ۔ص۱۶۰-۱۶۱۔

Marfat.com

کشف المحجوب کی اہمیت

کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوُّف پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب کاملین کے لیے رہنما اور عوام کے لیے پیرِ کامل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب نے نہ صرف تصوُّف کے خیالات کو عوام تک پہنچایا بلکہ تصوُّف کو عوامی تحریک بنانے اور صوفیہ سلاسل کو منظم کرنے میں مدد دی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ تصوُّف کی کتابیں اب تک عربی میں تھیں اس لیے عوام کو استفادہ کا موقع بہت کم تھا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی اس لیے حقیقی تصوُّف کو عوام تک پہنچانے میں اس کتاب کا بڑا ہاتھ ہے۔ شیخ ہجویریؒ کی اس کتاب نے ایک طرف تصوُّف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا اور دوسری طرف اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں۔ (۱)

''کشف المحجوب'' حضرت داتا گنج بخشؒ کی آخری تصنیف ہے جو انھوں نے جناب ابوسعید ہجویریؒ کی درخواست پر لکھی۔ درخواست میں تصوُّف کے مقامات، اشارات، رموز اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے بارے میں سوالات تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے سوالات میں پوشیدہ اخلاص اور سچی طلبِ حق کی خوشبو محسوس کر کے ان سوالات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب تالیف کی جس میں اہلِ علم کا راستہ تحقیق بتایا۔ ''کشف المحجوب'' کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بڑے بڑے صوفیہ نے اس کی تعریف کی ہے۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ کشف المحجوب کا ذکر کرتے ہیں اور حضرت جہانگیر اشرف سمنانیؒ کے ملفوظات کی کتاب میں جگہ جگہ اس کتاب سے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، ملا جامیؒ اور داراشکوہ نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ مارٹن لنگز، اے جی آربری اور ای جی براؤن نے ''کشف المحجوب'' کو دنیا کے سامنے بطورِ سند پیش کیا ہے۔ پروفیسر نکلسن نے ''کشف المحجوب'' کا

Marfat.com

انگریزی میں ترجمہ کیا اور کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ اس کتاب نے برصغیر پاک وہند میں اسلامی تصوُّف کو پہلی مرتبہ متعارف کروایا۔

کشف المحجوب کی افادیت کے پیشِ نظر اس کے خطی نسخے بہت جلد اطراف واکناف میں پھیل گئے تھے۔اس کے قلمی نسخے دنیا کی تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ایل ایس ڈگن کی فہرست کے مطابق کشف المحجوب کے قلمی نسخے وی آنا، پیرس، برٹش میوزیم، لینن گراڈ یونیورسٹی، انڈیا آفس لائبریری لندن، تاشقند پبلک لائبریری، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال برلن اور لاہور کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان میں نوسو سال پرانا نسخہ بھی شامل ہے۔

کشف المحجوب کے قدیم ترین قلمی نسخوں کے سلسلے میں لاہور میں بھی بعض نادر نسخے موجود ہیں۔دو منقش قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہیں جن میں سے ایک پر ۱۲۶۵ھ درج ہے۔اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا ایک قلمی نسخہ بھی پبلک لائبریری لاہور میں ہے۔بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ایک قلمی نسخہ میاں محمد صدیق (مرحوم) یکے از سجادہ نشین درگاہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہ قدیم ترین فارسی نسخہ ہے جس کی سب سے پہلے نول کشور لکھنوی نے نقل کروائی اور طباعت کے بعد شائع کیا۔ایک قدیم قلمی نسخہ شیخ محمد نبی بخش (مرحوم) یکے از سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخشؒ کے پاس موجود تھا جو رضا پبلی کیشنز لاہور نے طبع کروا کر شائع کیا ہے۔(۲)

کشف المحجوب کی ایک حیثیت تصوُّف کی کتب کے ماخذ کی بھی ہے۔ یہ کتاب صوفیائے کرام کے مشہور و مستند تذکروں اور تصوُّف کی معتبر کتابوں کا ماخذ ہے۔حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ نے ''تذکرۃ الاولیاء'' میں ''کشف المحجوب'' سے صوفیائے متقدمین کے حالات اور ان کے اقوال معمولی سی تبدیلیِ الفاظ کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ملک الشعراء بہار نے ''سبک شناسی'' (ص:۲۰۶، ۲۰۹) میں اس کی واضح مثالیں بھی پیش کی ہیں۔مولانا جامیؒ نے جہاں کشف المحجوب سے استفادہ کیا وہاں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے ''لطائف اشرفی'' میں کشف المحجوب کے حوالے دیے ہیں۔حضرت خواجہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے مکاتیب میں کشف المحجوب کی عبارات بطورِ سند نقل کرتے ہوئے حضرت داتا گنج بخشؒ کی عظمت کا اعتراف بھی

Marfat.com

کیا ہے۔ حضرت خواجہ پارساؒ نے اپنی تصنیف ''فصل الخطاب'' کی متعدد فصول اور مختلف مقامات پر ''کشف المحجوب'' کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے اپنی تصانیف میں کشف المحجوب کے حوالے دیے ہیں۔

قاضی جاوید کے مطابق حضرت داتا گنج بخشؒ کے فکری نظام کی بنیادی خصوصیت شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے (۳) اور ''کشف المحجوب'' شریعت اور طریقت کے قواعد وضوابط، اسرار ورموز اور صوفیہ نہ فکر ونظر کے متعلق ہر دور میں عظیم تخلیق قرار دی گئی ہے۔ (۴) ''کشف المحجوب'' طریقت وشریعت میں توازن اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے اور صوفیانہ عمل کی راہیں متعین کرنے کے لیے لاثانی اور بے بہا روحانی خزینہ ہے۔ اس کتاب کا روحانیت کے فروغ میں بڑا ہاتھ ہے۔ ''کشف المحجوب'' کو تصوّف کے آئین کا درجہ حاصل ہے۔ شریعت اور طریقت کی ہم آہنگی صوفیانہ اعتدال پسندی کا تقاضا کرتی ہے۔ سید علی ہجویریؒ بنیادی طور پر اعتدال پسند مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو حلاجی المیے کے بعد ہونے والی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ظہور پذیر ہوا تھا۔ حلاجی المیے کے بعد تصوّف میں درمیانی راہ اور اعتدالی رویہ اختیار کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ اس رویے کی تاویل یوں کی گئی کہ داخلی صداقت اور مذہبی سچائی ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ اس رویے کی پرجوش وکالت امام غزالیؒ نے کی۔ غزالیؒ سید علی ہجویریؒ کے ہمعصر تھے چناں چہ سید علی ہجویریؒ نے بھی انحراف اور روایت کے بیچ کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانے میں اعتدال پسندی کا رجحان مقبول تھا اور محفوظ بھی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سید علی ہجویریؒ کے زمانے کی پنجاب کی صورتِ حال بھی انحراف پسندی سے دامن بچانے کا تقاضا کرتی تھی۔ چناں چہ انھوں نے طریقت کو شریعت کے دائرے میں رکھنے پر زور دیا تھا۔ (۵)

کشف المحجوب انسانی رویوں کو سماجی و معاشرتی سطح پر متوازن بنانے میں رہنمائی کرتی ہے۔ داتا صاحب کی نگاہِ دور رس معاشرتی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتی تھی، اس کی وضاحت کشف المحجوب کے موضوعات سے ہوتی ہے۔ جیسے معاشرتی زندگی کے آداب و احکام آداب اور آدابِ سفر وغیرہ۔ آدابِ معاشرت کے سلسلے میں داتا صاحبؒ کی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ وہ پیغام جو حضرت علامہ اقبال نے حضرت داتا علی ہجویریؒ کے نو سو سال بعد مسلم قوم کو دیا، اس پیغام سے وہ عوام کو کئی سو سال پہلے آگاہ کر چکے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر بزرگ نے معاشرہ کو صالح بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اسلام کے عین مطابق نہ صرف خود عمل کیا بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اس راہ پر چلنے کا حکم دیا۔ (۶)

کشف المحجوب کے موضوعات ہی اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پہلے باب میں علم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں فقر پر بحث ہے۔ صوفی کی اصلیت پر محققانہ بحث ملتی ہے تو تصوّف پر بحث بھی ہے۔ ائمہ صحابہ کرامؓ، ائمہ اہلِ سنت، اہلِ صفہ، ائمہ طریقت، تبع تابعین، ائمہ متاخرین، اہلِ طریقت کے مختلف مکاتب کے صوفیہنہ عقائد، افکار و نظریات کے علاوہ حقیقتِ نفس، ولایت کے اسرار و رموز، صبر و رضا، مدہوشی اور ہوش، فنا و بقا، معرفتِ الٰہی، آدابِ محبت، جود و سخا، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ازدواجی زندگی، حقیقتِ سماع، بھوک، صوفیانہ اصطلاحیں۔ الغرض کشف المحجوب حقیقت کی تلاش کا ذوق رکھنے والے باہمت لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ موضوع اور متن کے اعتبار سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں دعوت و تبلیغ کے لیے جو دستورالعمل عوام کے سامنے پیش کیا، اس سے جہاں عبد و معبود کے باہمی تعلق کو استحکام حاصل ہوتا ہے، وہاں دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی افادیت آج بھی مسلّم ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا شمار ان ائمہ تصوّف میں ہوتا ہے جنھوں نے تزکیۂ نفس کی اس طرح تعلیم دی کہ برِصغیر میں مسلم تخلیقی فکر کی داغ بیل پڑی۔ وہ ایک ایسے صوفی ہیں جو انسان کی زندگی میں اجتماعی انقلاب کے نقیب ہیں۔ ان کی تعلیمات جو یقیناً ان کی روحانی قوت و تاثیر پر دلالت کرتی ہیں، انسانی زندگی کی ہر سطح پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ ایک ہزار سال گزرنے کے باوجود نہ صرف اپنی تعلیمات میں زندہ ہیں بلکہ عوام کے قلوب کو بھی مسلسل مسخر کیے ہوئے ہیں۔ (۷)

''کشف المحجوب'' حضرت داتا گنج بخشؒ کے سفرنامہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ داتا صاحبؒ غزنی سے سفر اختیار کر کے پاک و ہند کے متعدد شہروں میں گئے۔ انھوں نے وہاں کی

Marfat.com

تہذیب وتمدن، رسم ورواج، عقائد، ادب اور زبان سے گہری واقفیت حاصل کی اور پھر لاہور کو اپنا مستقل مستقر قرار دے دیا۔ صوفیہ کے نزدیک سفر کی صعوبتیں ایک مجاہدہ ہوتی ہیں جو مشاہدہ کو فروغ دیتی ہیں۔ داتا صاحبؒ نے اس مجاہدہ کو حدِ کمال تک پہنچا کر جہاں ایک طرف اپنے مشاہدہ کو فروغ دیا وہاں مشائخ وصوفیہ کی قربت میں روحانی فیوض وبرکات کی ایک ایسی دولت جمع کی جو نہ صرف آپ کے کردار میں تصویر ہوگئی بلکہ قلم کی نوک پر آ کر ''کشف المحجوب'' کی صورت اختیار کر گئی۔ (۸)

کشف المحجوب کے مندرجات اپنی معنویت وتاثیر میں کاملین کے لیے پیرِ کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے دلوں کو عرفان وایقان کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ کتاب تشکیک کے دروازہ کو بند کرتی ہے۔ شبہات کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کی دستگیری کرتی ہے اور گمانِ ناقص کو دل سے نکال کر یقین کی دنیا آباد کرتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے زمان ومکان کے حجابات اٹھتے ہیں اور راہِ حق کا متلاشی اپنے نفس کو پہچان کر اپنے رب سے قرب اختیار کرتا ہے۔ اس کے دل میں باطنی نفسانی خواہشات سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے انسان کے طور پر اپنے باطن سے ظہور کرتا ہے کہ وہ خلقِ خدا کے لیے نافع اور خدا کے سامنے سرخرو ہو جاتا ہے۔ (۹)

دورِ حاضر میں داتا صاحبؒ کے افکار وتعلیمات کی اہمیت راسخ الاعتقادی اور صوفیانہ روشن خیالی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششوں پر انحصار رکھتی ہے۔ اس ہم آہنگی کو پیدا کرنے کی خاطر آپ نے شریعت اور طریقت میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کیا بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک جدلیاتی اضافت کے موجود ہونے کے قائل ہیں۔ آپ کے نزدیک شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے شریعت اور طریقت کے باہمی امتزاج کو روحانی ذات کی تکمیل کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ گویا شریعت اور طریقت کو اگر جدا کر دیا جائے تو فرد کی روحانی ذات اپنے حتمی امکانات کے حصول میں ناکام رہتی ہے۔ (۱۰)

کشف المحجوب میں انسان کو درپیش نفسی مسائل کا حل بھی موجود ہے کیوں کہ اس کتاب میں ایسا نظامِ حقائق وضع کیا گیا ہے جو بنیادی مباحث کی ضروریات کو پورا کرنے کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ انسان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیتا ہے جہاں نہ صرف وہ اپنی ذات میں دوام پاتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک معیاری اور نافع انسان کے طور پر تاریخ میں زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ خواجہ رضی حیدر لکھتے ہیں:

> ''علم اپنی اساس میں معلوم ہوتا ہے اور بتائی گئی حقیقت کا اقرار و اثبات کرتا ہے۔ یہ object-oriented ہوتا ہے جب کہ تصوُّف انسان کی اندرونی کلّیت کو گرفت میں لے کر ایک ایسی یکجائی برآمد کرتا ہے جو معرفتِ نفس کہلاتی ہے اور ارتفاعِ ذات میں معاون اور نافع ہوتی ہے۔ معرفتِ حقائق جو تعقل اور تخیل کی یکجائی میں مضمر ہے، دراصل ولایت کا اوّلین زینہ ہے اور داتا صاحبؒ اپنی تعلیمات کے آئینہ میں ولایت کے صورت گر ہیں۔ مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی نے اپنی کتاب ''سوانح حیات داتا گنج بخشؒ لاہوری'' میں علم اور معرفت کو کشف المحجوب کے مندرجات کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عالم اپنے عمل کو اپنی زبان و قلم سے بیان کرتا ہے جب کہ عارف اپنی معرفت کو اپنے حال اور عمل سے ظاہر کرتا ہے اور حضرت داتا صاحبؒ کی ذات میں علم اور معرفت کی یکجائی نے آپ کی زبان اور آپ کے حال کی مقبولیت کو ارفع منزل عطا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ سے مل کر اور آپ سے کلام کر کے لوگوں کے قلوب کا قبلہ درست ہو جاتا تھا۔''(۱۱)

داتا صاحبؒ کے صوفیانہ فکری نظام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ پہلے صوفی تھے جنھوں نے غور و فکر کو بنیاد بنا کر بذریعہ کشف انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ایک ایسی نافع صورتِ حال دریافت کی ہے جو اس وقت بھی اپنے اندر جدت رکھتی تھی اور آج بھی جدید ترین اذہان کو اپنا اسیر کیے ہوئے ہے۔(۱۲)

حضرت داتا گنج بخشؒ کی تعلیمات میں عجز و انکساری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ عجز و انکساری کی ترویج میں بسا اوقات اخفائے ذات و صفات کو بھی روا تصور کرتے ہیں۔ آپ

Marfat.com

نے ''کشف المحجوب'' میں ''ملامت'' کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے جس میں فخر و تکبر کو آفت اور حجاب قرار دیا ہے۔ داتا صاحبؒ صوفیہ کو ایک مثالی انسان کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ بیسویں صدی کا مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ ''بہترین انسانی خوبیوں کا اظہار صرف تصوُّف ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے'' کشف المحجوب میں داتا صاحبؒ کی تعلیمات ایک انسان کو مثالی مسلمان بنانے کا دستور العمل بھی فراہم کرتی ہیں۔

کشف المحجوب کا سارا انداز اور اسلوب ایک وضاحتی کتاب جیسا ہے جو ہر مسئلے پر تمام پہلوؤں اور افکار و مطالبِ فکر سے بھی روشنی ڈالتی ہے۔ (۱۳)

کشف المحجوب کا رویہ تنقیدی اور محاسباتی ہے۔ مصنف نے جا بجا موقع محل کی مطابقت سے کڑی تنقید سے بھی کام لیا ہے بلکہ اسی تنقیدی حوالے سے انھوں نے کئی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ (۱۴)

''کشف المحجوب'' لسانی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب کے آخری ابواب اپنی علمی اور لسانی حیثیت سے بڑے اہم ہیں۔ بقول ملک الشعراء بہار کشف المحجوب فارسی کے سبکِ قدیم کا ایک نادر نمونہ ہے اور سامانی دور کی نثر کے نزدیک تر ہے۔ اگر چہ اس سے بدر جہا بالاتر اور اصل تر ہے۔ کشف المحجوب کی زبان سعدیؒ اور حافظؒ کی قدیم فارسی زبان سے ہٹ کر ملک خراسان کی زبان ہے جس کا محاورہ سمجھنے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مصنف نے اس زمانے کے فنِ تحریر کے مطابق قافیہ سنجی سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی عبارات بڑی حد تک منظوم نثر کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ فارسی دان طبقہ کے لیے یہ کتاب فصاحت و بلاغت کا بیش بہا مرقع ہے۔ (۱۵)

کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ تصوُّف کے ہر مضمون کو یہاں تک کہ وحدت الوجود اور قضا و قدر جیسے مشکل مضامین کو بھی قرآن و سنت سے ثابت کیا گیا ہے اور شریعت کے خلاف جتنے مکاتیبِ فکر اور نظریات اس زمانے میں مروج تھے سب کی تردید کر کے حقیقی اسلامی تصوُّف کو پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی دنیا میں بعض باطل فرقے مثل معتزلہ و قرامطہ وجود میں آ چکے تھے جن کی وجہ سے چند نام نہاد صوفیوں نے غیر شرع عقائد اختیار کر رکھے تھے لیکن

Marfat.com

حضرت داتا گنج بخشؒ بقول واحد بخش سیال ''ایسا کلہاڑا لے کر آئے کہ تمام باطل فرقوں کا قلع قمع کر کے تصوُّف کو حقیقی اسلامی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت شیخؒ نے اسلام کی ہر بات اور ہر رکن کے حقیقی باطنی معانی و مطالب بیان فرمائے ہیں۔''(۱۶)

حضرت سید علی ہجویریؒ علم الکلام کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اگر چہ آپ نے اپنی کتاب میں جا بجا علم الکلام اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے تاہم آپ کے تمام فیصلے آپؒ کی باطنی قوت اور خداداد بصیرت کا نتیجہ ہیں۔ (۱۷)

کپتان واحد بخش سیال لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ آپؒ کا ذخیرۂ کتب غزنی میں رہ گیا تھا آپ نے اپنی بے پناہ قوتِ حافظہ اور مسائلِ تصوُّف پر عبور کی بدولت ایسی مکمل اور جامع کتاب لکھی ہے کہ جس کی برابری فنِ ثقافت کے ایک ہزار سالہ دورِ ارتقاء کے بعد بھی کوئی کتاب نہیں کر سکی حالاں کہ فارسی زبان میں تصوُّف پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور ماہرینِ فن کا قول ہے کہ پہلی کوشش کرنے والا ہمیشہ پُر خار راستے سے گزر کر آنے والی نسلوں کے لیے راہ ہموار کرتا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ حضرت مصنف کی یہ پہلی کتاب ایک ہزار سال کے فنی ارتقاء کے باوجود بھی اب تک آخری کتاب یا حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔''(۱۸)

''کشف المحجوب'' ایک جامع تصنیف ہے اور اس کے مضامین کی تازگی اور موضوعات کی جامعیت آج بھی برقرار ہے۔ روسی مستشرق ژوکوفسکی نے کشف المحجوب کو حضرت ہجویریؒ کا شاہکار قرار دیا ہے اور مشہور مستشرق نکلسن نے تصوُّف کو بطورِ نظام مدوّن کرنے کا سہرا اس کتاب کے سر باندھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے ۹۶۴ ویں سالانہ عرس بمطابق ۲۶ تا ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء کے موقع پر کشف المحجوب کے مختلف ابواب کے حوالے سے وقیع مقالات پر مشتمل ''مضامینِ کشف المحجوب نمبر'' پیش کیا گیا۔ ''معارفِ اولیا'' کی اس خصوصی اشاعت کو محکمہ مذہبی امور واوقاف، پنجاب کی جانب سے حضرت داتا گنج بخشؒ کی بارگاہ میں نذر کرنے کی سعی کی گئی۔ اس کا مقصد کشف المحجوب کے مضامین کا عام سطح پر سادہ انداز اور لب ولہجہ میں ابلاغ تھا۔

Marfat.com

حواشی

۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخِ چشت''، ادارۂ ادبیات دہلی: باراوّل ۱۹۵۳ء، ص ۹۸-۹۹۔

۲) صاحبزادہ میاں سلیم حماد ''دیباچہ کشف المحجوب'' مشمولہ مجلّہ معارفِ اولیاء، جلد ۵، شمارہ۔ لاہور: مرکز معارفِ اولیاء، مارچ ۲۰۰۷ء۔

۳) قاضی جاوید ''سید علی ہجویریؒ کے بارے میں چند باتیں'' مشمولہ ''معاصر انٹرنیشنل (لاہور)''، جولائی ۲۰۰۵ء، ص ۵۷ تا ۷۳۔ (۲) ''داتا صاحبؒ'' (حیات وافکار) ترتیب وتدوین: محمد اکرام چغتائی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۰۱۔

۴) صوفی سکندر شیخ، مضمون ''حضرت مخدوم سید ابوالحسن علی ہجویریؒ رشد وہدایت اور علم وحلم کے پیر'' مشمولہ ''داتا صاحبؒ'' محمد اکرام چغتائی، ص ۴۴۵۔

۵) قاضی جاوید ''سید علی ہجویریؒ کے بارے میں چند باتیں'' مشمولہ ''داتا صاحبؒ''، ص ۳۹۰، ۳۹۱۔

۶) صوفی سکندر شیخ، مضمون ''حضرت مخدوم سید ابوالحسن علی ہجویریؒ رشد وہدایت اور علم وحلم کے پیر'' ص ۴۳۵ تا ۴۳۷۔

۷) خواجہ رضی حیدر مضمون ''داتا گنج بخش'' مشمولہ ''داتا صاحبؒ'' ص ۴۵۱۔

۸) ایضاً۔ ص ۴۵۴۔

۹) ایضاً۔ ص ۴۵۵۔

۱۰) ایضاً۔ ص ۴۵۶۔

۱۱) ایضاً۔

۱۲) ایضاً۔ ص ۴۵۷۔

۱۳) محمد علی چراغ ''کشف المحجوب'' مشمولہ ''معارفِ اولیاء'' جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۲۰۷۔

۱۴) ایضاً۔ ص ۲۰۸۔

۱۵) کپتان واحد بخش سیال ''مقدمہ از شارح'' مشمولہ ''معارفِ اولیاء''، جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۱۴۳۔

Marfat.com

۱۶) ایضاً۔ص ۱۴۳-۱۴۴۔

۱۷) حضرت شہید اللہ فریدیؒ بحوالہ کپتان واحد بخش سیال ''مقدمہ از شارح''، مشمولہ مجلّہ ''معارفِ اولیاء'' جلد ۵، شمارہ ۱، ص ۱۴۷۔

۱۸) کپتان واحد بخش سیال، ''مقدمہ از شارح''، مشمولہ ''معارفِ اولیاء''، ص ۱۴۳۔

Marfat.com

رسالہ غوث الاعظمؒ مع شروحات اور مکتوباتِ عشق

رسالہ غوث الاعظمؒ حضرت میراں محی الدین شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ چھٹی صدی ہجری سے علما اور مشائخ صوفیہ میں متداول ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں یہ رسالہ ہندوستان میں پہنچ چکا تھا اور اہلِ علم کے کتب خانوں میں موجود تھا۔ ساتویں آٹھویں صدی ہجری کی مشہور ہستیوں خواجہ حمید الدین ناگوریؒ، علامہ رکن الدین عماد کاشانیؒ اور حضرت سراج محمد گجراتیؒ نے اپنی تصانیف میں اس رسالے کے منتخبہ نکات لکھے۔ دسویں صدی ہجری میں حضرت شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ان کے پاس یہ رسالہ موجود تھا۔ یہ رسالہ بہت سارے ناموں سے موسوم اور مشہور ہے: رسالہ غوث الاعظم، الہاماتِ غوث الاعظم، رسالۂ معرفتِ فتحِ ربانی، مقالاتِ غوث الصمدانی، سلوکِ قادریہ، فتوحاتِ ربانی فیوضاتِ سُبحانی۔ ہندوستان میں یہ رسالہ مطبع نول کشور میں طبع ہوا۔ اس رسالے کی بہت سی شروح عربی فارسی میں ہوئی ہیں۔ قاضی احمد عبدالصمد لکھتے ہیں کہ انھوں نے دو فارسی شرحوں کا ترجمہ کر دیا ہے۔

پہلی شرح جواہر العشاق خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ہے۔ یہ شرح دہلی میں ۷۵۰ ہجری کے بعد لکھی گئی ہے۔ شرح میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا مخصوص اندازِ تفہیم اور سالکانہ، والہانہ تعلیم ہے۔ تزکیۂ باطن، عاشقانہ روش، حضرت غوث الاعظم کا مقام و مرتبہ اور تصوُّف کی اصطلاحاتِ وجود و شہود، وحدت الوجود کا ذکر ہے۔

دوسری شرح نشاط العشق حضرت ملک شاہ صدیقی کی ہے جو اودھ کے رہنے والے تھے۔ اس شرح میں تصوُّف کے نظریاتِ علمیہ اور عملیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلی شرح عاشقانہ تفہیمی اور دوسری مُحبّانہ تعلیمی انداز رکھتی ہے۔ رسالہ غوث الاعظم مع شروحات جواہر العشاق و نشاط

Marfat.com

العشاق کراچی کے ادارہ معارفِ اسلامیہ میں طبع ہوا۔

مکتوباتِ عشق حضرت پیر سید شیر محمد گیلانی قادری فتح پوریؒ کے منظوم پنجابی خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے مرشدِ کامل جناب قطب الاقطاب حضرت سید قطب علی شاہ بخاری پیر محلوی کو لکھے۔ یہ خطوط نہ صرف سائیں شیر پاک کے قلبی اور روحانی واردات کا اظہار کرتے ہیں بلکہ عشقِ حقیقی کے رموز کا ایک قیمتی خزانہ ہیں۔ مکتوباتِ عشق میں خیالات کی ندرت اور جذبات کی شدت ہے۔ اس کتاب کا سرورق متن کی طرح سادہ اور جاذبِ نظر ہے اور صادقین نے اسے تیار کیا ہے۔ اس کتاب کے ناشر سجادہ نشین دربار قطبیہ سندیلیانوالی شریف ضلع فیصل آباد پیر سید اسرار حسین شاہ ہیں۔ یہ کتاب نئی شکل کے ساتھ اشاعتِ دوم ہے جو ستمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

کتاب کے شروع میں دو تصاویر ہیں۔ ایک حضرت پیر سید قطب علی شاہ بخاریؒ کی اور دوسری تصویر حضرت پیر سید شیر محمد گیلانی قادریؒ فتح پوری کی ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵ سے ۹۵ تک ۲۴ منظوم خطوط ہیں پھر مولود شریف، کافیاں، ابیات، ریل نامہ، دوہڑہ جات سی حرفیاں، رباعی و جواب رباعی، شرحِ اوّل مکتوب، شرحِ دوم مکتوب، شجرۂ غوثیہ باغنامۂ طلبیہ (نظم) اور آخر میں رُباعی دعائیہ ہے۔

شرحِ مکتوب اوّل اور دوم پیر امام جلوی غلام محمد صاحب جلوآنویؒ نے کی ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر حضرت پیر سید قطبؒ علی شاہ پیر محلوی کی دیگر تصانیف کا ذکر ہے۔ چھ کتابیں ردِ مذہب اہلِ تشیع کے سلسلے میں ہیں۔ ساتویں کتاب ردِ وہابیت کے سلسلے میں اور بقیہ تین کتابیں رموزِ معرفت پر مبنی ہیں۔

۱) شوائظ البرقات فی ردِ رمی الجمرات
۲) رسالہ ءردِ شیعہ بقول امامیہ
۳) رسالہ انوارِ قدسیہ فی ردِ رموزِ بدیعہ
۴) فہرست نہج البلاغۃ
۵) امدادِ الٰہیہ
۶) الہاماتِ الٰہیہ
۷) رسالہ حیاتُ النبیؐ
۸) اسرار المعرفت
۹) مناظرہ ہیر و قاضی
۱۰) رسالہ مراۃ الفقراء (ملفوظات قطبیہ) مرتب فقیر سلطان احمد

Marfat.com

سیر الاولیا۔صوفیائے پاک و ہند کا پہلا تذکرہ

''سیر الاولیاء'' برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ کا پہلا قدیم فارسی تذکرہ ہے جو فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا۔''سیر الاولیاء'' کے مصنف سید محمد مبارک علوی کرمانی المعروف بہ میر خورد ہیں۔ یہ تذکرہ اُس دور کی روحانی تاریخ ہے جس میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ بالخصوص حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی اور اُن کے خلفاء کے حالات، واقعات اور تعلیمات ہیں۔ ''سیر الاولیاء'' کا اُردو میں ترجمہ اعجاز الحق قدوسی نے کیا ہے۔مترجم کے نزدیک ''سیر الاولیاء'' کا سنہ تصنیف یقینی طور پر متعین نہیں ہو سکا لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ تذکرہ ''تاریخِ فیروز شاہی'' (برنی) کے بعد لکھا گیا اور ''سیر الاولیاء'' سنہ ۷۱۶ھ اور ۷۷۰ھ کے درمیان کسی وقت لکھی گئی ہو گی۔(۱) متاخرین نے اپنے تذکروں میں ''سیر الاولیاء'' سے خوشہ چینی کرتے ہوئے میر خورد کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا ہے۔اس سلسلے میں درج ذیل چار تذکروں کا نام لیا جا سکتا ہے:

۱) سیر العارفین

۲) گلزارِ ابرار

۳) اخبار الاخیار

۴) خزینۃ الاصفیاء

چوں کہ مضمون میں ''سیر الاولیاء'' کا اُردو ترجمہ زیرِ نظر ہے، لہٰذا اس ترجمے کی خصوصیات بیان کرنا بھی ضروری ہے۔اعجاز الحق قدوسی کے ترجمے کی حسبِ ذیل خصوصیات ہیں:

۱) ترجمہ سلیس و بامحاورہ اور دلنشیں ہے اور نفسِ مفہوم کے ساتھ ساتھ نفاست، سلاست اور شگفتگی بھی ہر جگہ قائم ہے۔ترجمے میں زبان کی روح کو اس طرح منتقل کیا گیا ہے کہ

Marfat.com

ترجمہ حشو وزوائد سے پاک بھی ہے اور سلاست وروانی میں اپنی مثال آپ ہے۔

۲) اصل متن ذیلی عنوانات سے بالکل خالی اور معرّیٰ ہے۔ اعجاز الحق قدوسی نے ترجمے میں ہر جگہ ذیلی عنوانات قائم کر کے ترجمے کی افادیت بڑھادی ہے۔

۳) ترجمے میں معلوماتی حواشی دیے گئے ہیں۔

۴) ہر جگہ سنہ ہجری کے ساتھ سنہ عیسوی کی مطابقت کی گئی ہے۔

۵) متن فل سٹاپ، کاموں اور پیروں سے بالکل معرّیٰ ہے جب کہ مترجم نے ہر جگہ کامے، فل اسٹاپ اور پیرے قائم کیے ہیں۔

۶) ترجمے میں ہر جگہ جہاں سے اصل متن شروع ہوتا ہے، اصل متن کے صفحے کا نمبر قوسین میں اُردو ہندسوں میں دے دیا ہے تا کہ وہ قاری جو ترجمے کی مطابقت اصل متن سے کرنا چاہے، آسانی سے کر لے۔ (۲)

''سیر الاولیاء'' کی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ تذکرہ حضرت سلطان المشائخ اور اُن کے خلفاء کے سوانحی حالات، ملفوظات اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے معارفِ تصوُّف اور تعلیمات کو بڑے سلیقے سے پیش کرتا ہے اور اس خصوصیت کی وجہ سے برصغیر کے تمام تذکروں میں ممتاز اور منفرد نظر آتا ہے۔ دوسرے اس کا اسلوبِ نگارش بھی اچھوتا اور دلکش ہے۔ مصنف کا فطری مزاج تصوُّف سے ہم آہنگ ہے اس لیے انھوں نے تصوُّف کے باریک نکتوں کو اپنے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔ ''سیر الاولیاء'' اپنے وثوق، استناد اور شہادتِ عینی کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ''سیر الاولیاء'' کے مصنف سید محمد مبارک علوی کرمانی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید تھے اور اُن کے اور اُن کے جلیل القدر خلفاء کے حالات کے عینی شاہد تھے۔ سید محمد مبارک المعروف بہ امیر خورد کے خاندان نے اپنے وقت کی برگزیدہ ترین ہستیوں سے کسبِ نور کیا ہوا تھا۔ اُن کے نانا، دادا، والد اور چچا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے قربِ خاص رکھتے تھے۔ خود مصنف محبوبِ الٰہی کی خانقاہ سے منسلک رہے۔ لہٰذا وہ اکثر اوقات واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ بعض روایات مصنف نے اپنے بزرگوں سے سنیں جو ثقہ راوی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''سیر الاولیاء'' نہایت مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

Marfat.com

بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے اسی کتاب سے بہت کچھ مواد حاصل کیا ہے۔ (۳)

تذکرہ ''سیر الاولیاء'' خلجیوں، علائیوں اور تغلقوں کے دور کی ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی روایات کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہ دور عجیب دور تھا۔ مسلمان تعداد میں کم تھے لیکن سیاسی اقتدار اُن کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اسلام کی عظیم الشان تہذیب، ہندوستان کے قدیم کلچر سے ٹکرا رہی تھی۔ برِعظیم کے دروازے کھل چکے تھے۔ ایران، توران، عراق وعرب کے علماء، صلحاء اور صوفیہ شعرا برابر آ رہے تھے اور اس برعظیم میں ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور اس سے قبل کا زمانہ اس معاشرے کے بچپن کا زمانہ ہے۔ صاحبِ ''سیر الاولیاء'' اُسی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں مرکزی کردار حضرت نظام الدین اولیاؒ ہیں لیکن اگلے زمانے کے سربرآوردہ صوفیوں اور ہمعصر عالموں، صوفیوں اور مریدوں کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔ (۴)

''سیر الاولیاء'' سے اُن تمام بزرگوں کے کردار و گفتار پر روشنی پڑتی ہے جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ اسلام کا عملی نمونہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ بزرگ نہ طاقت و جبروت کے آگے سر جھکاتے تھے نہ دولت و ثروت سے مرعوب ہوتے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے، نانِ جویں کھانے والے، لکڑیاں بیچ کر روزی حاصل کرنے والے ایسے غنی تھے کہ دولت کی تھیلیوں کو ٹھکرا دیتے تھے۔ ''سیر الاولیاء'' میں جگہ جگہ ایسے واقعات ملیں گے کہ حاکم و بادشاہ ان برگزیدہ ہستیوں کو مرعوب و محکوم بنا کر رکھنا چاہتے تھے مگر یہ لوگ لا الہ الا اللہ کی عملی تفسیر و تصویر تھے۔ (۵)

''سیر الاولیاء'' میں مشائخِ کبار کے مناقب ''منھم'' کی علامت سے شروع کیے گئے ہیں اور اس علامت میں ابوالقاسم قشیریؒ اور شیخ علی ہجویریؒ کا اتباع کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر نے اپنے رسالے میں اور موخر الذکر نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں اس علامت کو اختیار کیا ہے۔ میر خورد نے ''سیر الاولیاء'' میں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے لیے ''سلطان المشائخ شیخ الشیوخ العالم نظام الحق والشرع والدین'' کا خطاب اختیار کیا ہے اور پوری کتاب میں اس خطاب کی پابندی کی ہے۔ ''سیر الاولیاء'' میں لکھے گئے اشعار کی ابتدا میں اُن کے شعراء کا نام لکھا گیا ہے۔ جن اشعار کے تخلیق کرنے والوں کا نام معلوم نہیں ہو سکا، اُن کے نام کے بجائے ''بزرگ'' لکھا گیا ہے۔

Marfat.com

''سیر الاولیاء'' کی وجہ تالیف لکھتے ہوئے میر خورد لکھتے ہیں:

''جب خاکسار کی عمر پچاس سال کی ہوگئی اور مجھ سے کوئی ایسا کام نہ ہوا کہ جو اُس بارگاہِ بے نیاز کے شایانِ شان ہوتا، میں اپنے ان افسوسناک حالات پر سخت حیرت میں تھا اور اس پر غور کرتا تھا کہ یہ امر کتنا میرے لیے باعثِ شرمندگی ہے کہ میں کوئی ایسا سامان نہیں رکھتا کہ مجھ گمراہ کے لیے دلیلِ راہ بن سکے۔ میں اسی دریائے حیرت میں غرق تھا کہ حق تعالیٰ کی عنایت اور توفیقِ ایزدی اس شکستہ دل کے شاملِ حال ہوئی اور حضرت سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ) کی محبت نے میری دستگیری کی۔ چناں چہ عالمِ غیب سے اس خاکسار کے دل میں القا کیا گیا کہ اے سرگشتۂ عالمِ تحیّر! قرار اختیار کر، اگر چہ خود یہ دنیا قرار کی جگہ نہیں۔ پھر شجرۂ معظم خواجگانِ چشت، اُن بزرگوں کے فضائل و کرامات اور اُن کے روح افزا کلمات اور ملفوظات، طور و طریقوں اور سلطان المشائخ سے اپنی عقیدت و ارادت کے واقعات اور اس درگاہ سے اپنے آباواجداد کے تعلق کو شرح وبسط سے لکھنے کی ہدایت کی گئی۔''(٦)

''سیر الاولیاء'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب بجائے خود ایک علیحدہ کتاب ہے اور دل کشا نکات اور لطائفِ دل ربا سے مزیّن ہے۔ ابواب درج ذیل ہیں:

باب اوّل

شجرۂ خاندان چشت از رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور پندرہ نکات ہیں۔

باب دوم

شیخ الاسلام شیخ معین الدین سجزیؒ اور آپ کے خلفاء کے مناقب اور فضائل کے بارے میں اور تین نکات ہیں۔

باب سوم

Marfat.com

بابا فرید گنج شکرؒ کے صاحبزادوں، پوتوں، نواسوں اور سلطان المشائخ کے اقربا کے بارے میں، جو ان دونوں بزرگوں سے تقربِ خاص رکھتے تھے۔

اس باب میں ''منھم'' کا لفظ ۷ ابار اور ''نکتہ'' کا لفظ ۱۰ بار استعمال ہوا ہے۔

باب چہارم

سلطان المشائخ کے خلفاء کے مناقب وفضائل اور کرامات

''منھم'' کے تحت دس خلفاء کے حالات۔

پہلے خلیفہ کے حالات چار نکات پر مشتمل ہیں۔

دوسرے خلیفہ کے حالات بھی چار نکات پر مشتمل ہیں۔

تیسرے خلیفہ کے حالات پانچ نکات پر مشتمل ہیں۔

چوتھے خلیفہ کے حالات تین نکات پر مشتمل ہیں۔

پانچویں خلیفہ کے حالات چھ نکات پر مشتمل ہیں۔

چھٹے خلیفہ کے حالات کے تحت کوئی نکتہ نہیں۔

ساتویں خلیفہ کے حالات دو نکات پر مشتمل ہیں۔

آٹھویں خلیفہ کے حالات تین نکات پر مشتمل ہیں۔

نویں اور دسویں خلیفہ کے حالات کے تحت کوئی نکتہ نہیں۔

باب پنجم

سلطان المشائخ کے بعض اعلیٰ مریدوں کے فضائل ومناقب اور کرامات۔

اس باب میں ''منھم'' کے تحت بیس مریدوں کا ذکر ہے اور آخر میں ''منھم'' کے تحت سلطان المشائخ کے اُنیس مریدوں کے بارے میں ایک فہرست ہے جو اُن کے اسمائے گرامی پر مشتمل ہے۔ اس باب میں نکات شامل نہیں۔

باب ششم

Marfat.com

یہ باب ارادت، مرید، مراد اور خلافتِ مشائخ کے بارے میں پندرہ نکات پر مشتمل ہے۔

باب ہفتم

یہ باب طہارت، آداب، ماثورہ دعاؤں اور مقبول وظائف کے بیان میں ہے جو حضرت شیخ فریدالحق والدینؒ اور حضرت سلطان المشائخؒ سے منقول ہیں۔ باب اٹھارہ نکات پر مشتمل ہے۔

باب ہشتم

اس باب میں سات نکات ہیں اور یہ محبت و شوق و عشق اور رویتِ باری تعالیٰ کے بیان میں ہے۔

باب نہم

بابِ سماع، وجد و رقص وغیرہ کے بیان میں گیارہ نکات پر مشتمل ہے۔

باب دہم

حضرت سلطان المشائخؒ کے بعض ملفوظات اور نوشتے۔ یہ باب دس نکات پر مشتمل ہے۔

ابواب کی تفصیل سے پہلے ''فہرست مضامین'' ہے جس میں مترجم کا تعارف، مصنف کی سوانح، مقدمہ، حمد، نعت اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے مناقب ہیں۔ پھر قصیدہ اور قصیدہ کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے مناقب ہیں۔ آخر میں وجہِ تالیف ''سیر الاولیاء'' ہے۔

ابواب کی تفصیل کے بعد آخر میں ''سیر الاولیاء'' کی تاریخی سرگذشت ہے اور پھر اشاریہ ہے۔

''سیر الاولیاء'' کو نقادوں نے ایک مستند تذکرہ تسلیم کیا ہے۔ یہ تذکرہ بیک وقت تاریخ بھی ہے اور سوانح بھی۔ یہ روحانی بالیدگی بخشنے کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ کی تبلیغی

Marfat.com

جدوجہد کو بھی بیان کرتا ہے۔اس تذکرے کے مترجم اعجاز الحق قدوسی تذکرے کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اس برصغیر پاک و ہند میں انسانیت اور اسلام کی بڑی خدمات انجام دی ہیں اور ان کی سیرت، تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ان کی تعلیمات میں ہمیں اخلاق و کردار کے وہ گراں مایہ خزانے ملتے ہیں، جن سے انسانی زندگی مالا مال ہوتی ہے۔ان کی تعلیمات علم وحکمت کی روح ہیں۔انھوں نے حقیقت کو شریعت کے جمال سے ہم آہنگ کر کے اپنی تعلیمات کو آراستہ کیا ہے، ان تذکروں کو جس قدر نئے نئے اسلوب سے پیش کیا جائے گا، اُن کی افادیت بڑھتی جائے گی۔''(۷)

اگر ''سیرالاولیاء'' کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے تو پہلے پانچ ابواب میں سلسلۂ چشت کے نامور صوفیہ اور اُن کے خلفاء کے حالات، مناقب و فضائل اور کرامات بیان کی گئی ہیں۔دوسرے حصے میں چھٹے باب سے دسویں باب تک متصوفانہ موضوعات اور احوال و مقامات کا ذکر ہے۔نمایاں مقاماتِ تصوُّف، احوال اور موضوعات حسب ذیل ہیں:

(۱) توبہ (۲) صبر و رضا (۳) فقر و غنا (۴) ریا (۵) توکل (۶) حلم (۷) عفو (۸) غضب (۹) حیا (۱۰) خوف و رجا (۱۱) دنیا اور ترکِ دنیا (۱۲) سماع (۱۳) وجد (۱۴) رقص (۱۵) علم اور علماء (۱۶) عقل (۱۷) محبت (۱۸) شوق (۱۹) عشق (۲۰) مراقبہ (۲۱) رویتِ باری تعالیٰ (۲۲) ذکرِ خفی (۲۳) آداب: (۱) کھانے کے آداب (۲) دسترخوان کے آداب۔

مذکورہ موضوعات کے علاوہ ارکانِ اسلام: نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے موضوعات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

''سیرالاولیاء'' کی مرکزی شخصیت حضرت نظام الدین اولیاؒ ہیں لہٰذا اُن کے ملفوظات بیان کیے جاتے ہیں جو مقاماتِ تصوُّف اور موضوعاتِ تصوُّف کا احاطہ کرتے ہیں:

۱) ''جس مقام پر اہلِ دل جمع ہوتے ہیں اُن کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک خوشبو

Marfat.com

اُس جگہ باقی رہتی ہے۔ یہ خوشبو خارجی نہیں بلکہ ہر ایک کی ذات میں نافہ ہے۔''(۸)

۲) ''یہ محبت کی خوشبو ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبت کرنے والوں کی ذات میں پوشیدہ رکھا ہے۔''(۹)

۳) آپ کی ساری عمرِ عزیز باطنی مشاغل میں اور شکستہ دلوں کے حالات دریافت کرنے میں صرف ہوئی جس کو حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ چناں چہ آپ فرماتے تھے کہ:

''بازارِ قیامت میں کسی سامان کی اتنی پُرسش نہ ہوگی جتنی شکستہ دلوں کو راحت پہنچانے کی۔''(۱۰)

۴) ''مریدِ حقیقی وہ ہے جس کو پیر تلقین کرے اور کہے کہ تم ہماری صحبت میں رہو یا ہم تمھاری صحبت میں رہتے ہیں۔''(۱۱)

۵) ''توبہ کی دو قسمیں ہیں:

توبۂ عوام اور توبۂ خواص۔ توبۂ عوام، گناہوں سے توبہ ہے۔ اور توبۂ خواص، ماسوا اللہ سے توبہ کرنا ہے۔ یہ توبہ سالک کرتے ہیں۔ اُنھیں چاہیے کہ وہ اس پر استقامت اختیار کریں، کیوں کہ سلوک کی راہ سے اُسی وقت گزرا جا سکتا ہے کہ اس پر استقامت ہو اور سالک کا مقصد طلبِ جاہ و کرامت نہ ہو اور اس راہ میں جو استقامت مطلوب ہے، وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع سے ہے۔''(۱۲)

۶) ''مرید کے دل میں پیر کی عقیدت اس درجہ اور اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ اپنے زمانے میں اپنے پیر سے بڑھ کر کسی کو نہ جانے اور صرف یہ جانے کہ میرا پیر ہی خدا تک پہنچا سکتا ہے۔..... جو شخص درست عقیدہ لے کر مرید ہونے آتا ہے، وہ جوہرِ قابل کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے شخص کا دل اپنے درست عقیدے کی وجہ سے فرحت حاصل کرتا ہے اور اپنے عقیدے ہی کے مطابق ہر شخص اپنا حصہ حاصل کرتا ہے۔''(۱۳)

۷) ''اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء پر کرامت کا چھپانا اُسی طرح فرض کیا ہے جس طرح انبیاء پر معجزے کا ظاہر کرنا فرض کیا ہے۔ پس اگر کوئی ولی کرامت کا اظہار کرتا ہے تو وہ ترکِ فرض کرتا ہے اور کتنا بُرا کرتا ہے۔''(۱۴)

Marfat.com

۸) ''سلوک کے سو مرتبے ہیں۔ان میں سے سترھواں مرتبہ کشف وکرامات کا ہے۔اگر سالک اسی کشف وکرامات کے چکر میں رہے تو تر اسی درجے کب طے کرے گا۔''(۱۵)

۹) ''جو دولتِ محبت حاصل کرنا چاہتا ہے، جب تک وہ اپنے عزیز جان وتن کو رضائے دوست کے لیے مصیبتوں میں نہیں ڈالتا،اسے ہرگز یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔''(۱۶)

۱۰) ''رویت کی حلاوت ہر شخص کو اس کے ذوق کے مطابق حاصل ہوگی، جب تک کہ شوق نہ ہو دیدار کا ذوق اور لذت حاصل نہیں ہوسکتی۔بعض اس دنیا سے دیدار کے مشتاق جاتے ہیں۔.....حقیقت یہ ہے کہ جس کو وہ اپنا جمال دکھانا چاہتا ہے،وہ دیکھتا ہے۔''(۱۷)

۱۱) حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ سماع کی چار قسمیں ہیں: حلال، حرام، مکروہ اور مباح۔

سماع مباح:

اگر صاحبِ وجد وحال حق کی طرف زیادہ راغب ہے،تو اس کے لیے سماع مباح ہے۔

سماع مکروہ:

اگر اس کا میلان مجاز کی طرف زیادہ ہے تو اس کے لیے سماع مکروہ ہے۔

سماع حرام:

اگر اس کا میلان بالکلیہ مجاز کی طرف ہے تو اس کے لیے سماع حرام ہے۔

سماع حلال:

اگر اس کا میلان بالکلیہ حق کی طرف ہے تو اس کے لیے سماع حلال ہے۔

صاحب سماع کو چاہیے کہ وہ اس کام میں حلال وحرام، مکروہ ومباح کو پہچانے۔(۱۸)

۱۲) حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا کہ شیخ بدرالدین بڑی عمر کے بزرگ تھے۔مسافران کی نسبت کہا کرتے تھے کہ اگر چہ شیخ بدرالدین بوڑھے ہو گئے مگر یہ رقص کس طرح کرتے ہیں۔شیخ نے فرمایا: وہ رقص نہیں کرتے بلکہ عشق رقص کرتا ہے۔ جسے عشق کی

Marfat.com

دولت حاصل ہے، وہ ہمیشہ رقص میں ہے۔

نیز سلطان المشائخؒ نے فرمایا کہ شیخ بدرالدین غزنوی بڑھاپے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے لیکن جب سماع سنتے تو اس طرح رقص کرتے جس طرح دس سال کا بچہ رقص کرتا ہے۔''(۱۹)

''عوارف'' میں لکھا ہے کہ بعض سچا رقص کرنے والے آواز اور وزن پر رقص کرتے ہیں لیکن ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ان کا رقص ایک طرح کی مناجات ہوتا ہے۔ (۲۰)

اسی قسم کے رقصِ عارفانہ کے متعلق حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں:

''رقص اُسی وقت اچھا ہے جب کہ انسان بے قرار اور بے اختیار ہو جائے، یہاں تک کہ سلطانِ عشق اس پر اس قدر غالب آ جائے کہ اگر وہ رقص نہ کرے گا تو اس کو نقصان ہوگا۔''(۲۱)

سماع کے متعلق فرمایا:

''سماع کا تعلق درد سے ہے، مزامیر وغیرہ سے نہیں۔ جو صاحبِ ذوق و اہلِ درد ہیں ان پر ایک شعر سن کر ہی ذوق اور رقت طاری ہو جاتی ہے، خواہ مزامیر ہوں یا نہ ہوں، لیکن جو عالمِ ذوق سے بے خبر ہیں اگر اُن کے سامنے قوال ہوں اور ہر قسم کے مزامیر بھی ہوں تو بے فائدہ ہے۔''(۲۲)

علم کے بارے میں فرمایا:

''جو شخص علم سیکھتا ہے، جلد مشہور ہو جاتا ہے اور علم حاصل کرنا درویشی سے زیادہ آسان ہے۔''(۲۳)

ترکِ دنیا کا مفہوم واضح کرنے کے لیے فرمایا:

''سونا، چاندی، گھوڑے اور سامان دنیا نہیں ہیں بلکہ اُن سے تعلق اور محبت رکھنا دنیا ہے۔ اگر اُن سے محبت و تعلق نہ رکھے تو یہ دنیا نہیں ہے۔''(۲۴)

حقیقتِ نیت یوں بیان فرمائی:

''لوگوں کی نظر عمل پر ہے اور حق تعالیٰ کی نظر نیت پر ہے۔''(۲۵)

Marfat.com

توکّل کے متعلق فرمایا:

''صرف اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے اور کسی مخلوق سے اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔''(۲۶)

عفو میں درویشوں کے مسلک کے بارے میں سلطان المشائخ نے فرمایا:

''اگر کوئی تیری راہ میں کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹے رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ اسی درمیان میں یہ کلمات ارشاد فرمائے کہ عام لوگوں میں تو یہی دستور ہے (کہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں) لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں۔ درویش نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہوتے ہیں۔''(۲۷)

''اگر دو شخصوں میں دشمنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک اپنا دل صاف کر لے، تو جب یہ اپنا دل دشمنی سے صاف کر لے گا تو دوسرے کے جانب سے بھی دشمنی کم ہو جائے گی۔''(۲۸)

ہم نشینی کے بارے میں فرمایا:

''ہم نشینی کا لطف تب ہے کہ آدمی جب کسی کا ہم نشین اور مصاحب ہو تو وہ اس پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے..... اپنے باطن پر غور کرنا چاہیے کہ اُس کی ملاقات سے تمھارے باطن پر کیا اثر پڑا۔ یہی چیز تم پر حقیقتِ حال کو ظاہر کر دے گی۔''(۲۹)

حسنِ اخلاق کے بارے میں فرمایا:

''حسنِ اخلاق یہ ہے کہ تیرا قلب فعلِ حق کے دیکھنے کی وجہ سے لوگوں کی جفا سے متاثر نہ ہو۔''(۳۰)

Marfat.com

حواشی

۱) سیر الاولیاء، سید محمد مبارک علوی کرمانی المعروف بہ میر خورد، مترجم: اعجاز الحق قدوسی، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۴ء، ص ۴۶-۴۷۔

۲) ایضاً۔ص ۳۱-۳۲۔

۳) ایضاً۔ص ۵۳۔

۴) ایضاً۔

۵) ایضاً۔

۶) ایضاً۔ص ۸۵-۸۶۔

۷) ایضاً۔ص ۳۳۔

۸-۹) ایضاً۔ص ۹۲-۹۳۔

۱۰) ایضاً۔ص ۲۴۳۔

۱۱) ایضاً۔ص ۵۰۶۔

۱۲) ایضاً۔ص ۵۱۶۔

۱۳) ایضاً۔ص ۵۲۶-۵۲۷۔

۱۴) ایضاً۔ص ۵۵۱۔

۱۵) ایضاً۔ص ۵۵۱۔

۱۶) ایضاً۔ص ۶۹۹-۷۰۰۔

۱۷) ایضاً۔ص ۷۴۴-۷۴۵۔

۱۸) ایضاً۔ص ۷۵۱۔

۱۹) ایضاً۔ص ۷۷۲۔

۲۰) ایضاً۔ص ۷۷۴۔

۲۱) ایضاً۔ص ۷۷۴۔

۲۲) ایضاً۔ص ۷۹۴۔

۲۳) ایضاً۔ص ۸۲۱۔

۲۴) ایضاً۔ص ۸۲۵۔

۲۵) ایضاً۔ص ۸۳۲۔

۲۶) ایضاً۔ص ۸۳۷۔

۲۷) ایضاً۔ص ۸۴۲۔

۲۸) ایضاً۔ص ۸۴۳۔

۲۹) ایضاً۔ص ۸۴۶۔

۳۰) ایضاً۔ص ۸۵۰۔

Marfat.com

تحقیق العارفین۔سلسلۂ قادریہ جلویہ کی نادر کتاب

''تحقیق العارفین'' اُن مکاشفاتِ عالیات کا مجموعہ ہے جو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق اولیائے اکملین وعلمائے محققین کے دلوں پر منکشف ہوئے ہیں اس لیے اس کا پورا نام ''تحقیق العارفین فی حقیقتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ یہ معارفِ ربانی عربی زبان میں ہیں جن کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے مؤلف ومترجم بیسویں صدی کے سلسلۂ قادریہ جلویہ کے بزرگ جناب امام جلویؒ پیر غلام محمد صاحب ہیں۔ تین سو بیس صفحات کی یہ کتاب اشرف پریس لاہور سے چھپی ہے۔

کتاب ''تحقیق العارفین'' تصوُّف کی مشہور اصطلاح ''حقیقتِ محمدیہ'' کے بارے میں ہے اس لیے قبلہ امام جلویؒ نے اس مقدس تالیف کو ''مرآتِ مقاماتِ احمدؐ اور آئینۂ کمالاتِ محمدیؐ'' کہتے ہوئے بارگاہِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بطور ہدیہ چند اشعار ''نذرِ عقیدت'' کے عنوان کے تحت لکھے ہیں:

اے شہنشاہِ رسولانِ سلف — وے دُرِ بحرِ محیطِ من عَرَف
در ازل کنزِ خفی ذاتِ حق — بُود در عین تو چوں دُر در صدف
سر نہادہ پیشِ تو اندر سجُود — تا اَبد جملہ ملائک صف بصف
ہر کہ آمد بر درت با صد نیاز — از خدا بشنید وَحی لَا تَخَفْ
تا بچشم آں سُرمۂ خاکت کشم — دیدۂ دِل دو ختم از ہر طرف
تحفہ چوں تو ندیدم در وجود — آمدم آئینۂ رُویت بکف
حُسنِ پاکت اَرمُغاں آوردہ ام
گر قبول اُفتد زہے عز و شرف(۱)

Marfat.com

مصنف معارفِ ربانی کو جمع کرنے اور ترجمہ کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

''علمائے محققین و کُبرائے عارفین کے علوم و حقائق عرفانی کے ناپیدا کنار سمندروں میں سے اسرارِ الٰہی و معارفِ ربّانی کے جواہرِ نایاب جو کہ خزائنِ قرآنی و احادیثِ رسول حقانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے قلوب و ارواحِ نورانی میں بطور کشفِ صحیح و وجدانِ صریح ظاہر ہوئے ہیں، جمع کرنے کا شوق دامن گیر ہوا اور چوں کہ سرمستانِ شراب طہور و حُسن پرستانِ آں نورٌ علیٰ نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس محبوبِ ذوالجلال والاکرام نورِ خدا محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمالاتِ حقی و مقاماتِ ذاتی کے انمول موتیوں کو اکثر زبانِ عربی کی لڑی میں پرویا ہے۔ اس لیے یارانِ طریقت کے ایماء اور طلبگارانِ اسرارِ حقیقت کے اقتضا کے مطابق اُن کا اُردو میں سلیس ترجمہ نہایت انسب و احسن معلوم ہوا۔ گو یہ بے کس کمتر از مور و مگس اس بات کے قابل نہیں کہ بُلبُلانِ باغِ رسالتؐ کے دلکش نغموں کی ترجمانی کر سکے اور طوطیانِ گلزارِ ولایت کی سدا خوش بولیوں کی رازدانی کا دم بھر سکے لیکن ؎ ذکرِ حبیبؐ کم نہیں وصلِ حبیبؐ سے

اس لیے صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقتِ پاک کے متعلق شاہانِ ولایت و سلاطین معرفت کے چند کلمات طیّبات و بعض مکاشفاتِ عالیات مع ترجمہ اُردو تحت السطور ذیل میں مسطور ہیں تا کہ شیفتگانِ جلوۂ جمالِ احمدیؐ و تشنگانِ بادۂ وصالِ محمدیؐ کی آنکھوں میں نور اور جانوں میں سرور حاصل ہو اور میرا اس میں سوائے نقل باللفظ اور ترجمہ کے کوئی دخل نہیں ہے۔''(۲)

مذکورہ بیان میں ''تحقیق العارفین'' کے مصنف کا عجز و انکسار اُن کے کمال کا غماز ہے اور کتاب نعتیہ رنگ لیے ہوئے مصنف کے عشقِ رسولؐ کی عکاس ہے۔ ''تحقیق العارفین'' اگرچہ ترجمہ ہے مگر مترجم کے اپنے دِلی جذبات بھی اس ترجمہ میں شامل ہیں۔

''تحقیق العارفین'' میں حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سعادتِ کبریٰ کی کیمیا اور صورت میں اپنی خوبیوں کا نمونہ پیدا کیا ہے اور وجود میں آپ کا مرتبہ اتنا بلند فرمایا ہے جس کے اوپر کسی موجود کا مرتبہ نہیں ہے(۳) اور اولیا اسرارِ محمدیؐ پر مطلع اور کمالِ محمدیؐ کے سمندر کے غوطہ زن ہیں۔ فقہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کے وارث اور عابدین آپؐ کے احوالِ ظاہری کے وارث اور مریدین آپؐ کے افعالِ قلبی و باطنی کے وارث اور عارفین آپ کے اخلاقِ روحانی اور اوصافِ رحمانی کے وارث ہیں۔ کاملین و محققین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسرار کے وارث ہیں اور وہ رتبۂ کمال کی حفاظت میں اقوال و افعال کی وراثت کے جامع ہیں۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے جب اپنی ذات وصفات کے خزانوں کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو آپؐ کی زبان کو فصاحتِ ربوبیت کا لباس پہنایا اور آپؐ کے دل کو نورِ معرفت سے روشن کیا اور آپ کی آنکھ کے لیے عینِ حقیقت کو ظاہر فرمایا اور پھر اولیا، عارفین اور فقہا کو حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

> ''حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اِسم اعظم ہے۔ پس جو شخص اسمِ اعظم کا طالب ہو وہ حقیقتِ محمدیؐ کے عشق میں محو ہونے کی کوشش کرے فائز المرام ہوگا۔''(۵)

> ''حقیقتِ محمدیؐ جو کہ تمام حقیقتوں کی حقیقت ہے اور ہر موجود کے لیے اس حقیقت میں بقدرِ قابلیت حصہ ہے لیکن بذاتِ خود وہ ایک ہی حقیقت ہے۔''(۶)

انسان کامل بالاتفاق آپؐ ہی ہیں۔ کتاب انسان کامل کے باب ۶۰ میں حضورؐ کی شانِ اقدس میں فرمایا گیا ہے:

وہ تحقیق کا نقطہ اور اس کا محیط ہے
وہ شریعت کا مرکز اور اس کا مکان ہے
وہ الوہیت کے دریا کا موتی اور اس کا کنارہ ہے

Marfat.com

اور وہ عبودیت کی زمین کی تلوار اور اس کی منزل ہے (۷)

کتاب انسانِ کامل کے مذکورہ باب میں ہی لکھا ہے:

''انسانِ کامل وہ قطب ہے جس پر وجود کے افلاک اوّل سے آخر تک گردش کرتے ہیں اور وہ جب سے موجود ہوا ہے ابدالآباد تک ایک ہے۔ پھر اس کے واسطے لباسوں میں قسم قسم کی حالت ہے اور پردوں میں ظاہر ہوتا ہے پس لباس کے اعتبار سے اس کا ایک نام رکھا جاتا ہے اور دوسرے لباس کے اعتبار سے اس کا وہ نام نہیں رکھا جاتا پس اس کا اصلی نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔..... پھر دوسرے لباسوں کے اعتبار سے اُس کے اور نام ہیں اور ہر زمانہ میں اُس کا ایک اسم ہے جو اُس زمانہ میں اُس کے لباس کے لائق ہے۔''(۸)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوبِ ازلی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کے شاہد ہیں۔ تحقیق العارفین کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عدم سے ظاہر کیا ہے، ارواح اور نفوس اور اجسام اور اجساد، معادن اور نبات اور حیوان اور فرشتہ اور جن اور انسان وغیرہ سے، سب کے آپؐ شاہد ہیں تا کہ افعالِ الٰہی کے اسرار اور اُس کی صفت وقدرت کے عجائب وغرائب کا ادراک جتنا کہ خلق کے لیے ممکن ہے، آپؐ سے نہ چھوٹے اور اُس میں آپؐ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ (۹) پس معلوم ہوا کہ مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صورت ومعنی کے اعتبار سے تمام کمالاتِ الٰہیہ اور کمالاتِ خلقیہ کا جامع ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقائقِ حقیہ اور حقائقِ خلقیہ کے مابین برزخ ہیں کیوں کہ آپؐ تمام حقیقتوں کی حقیقت ہیں۔ (۱۰) وضاحت کے لیے ''تحقیق العارفین'' میں دائرۂ وجود کے ذریعے دائرہ وجود یہ مثالیہ کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ اور اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعداد کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ''حصۂ اوّل تمام شد'' لکھا ہوا ملتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ حصۂ دوم بھی ہوگا جو فی الحال مجھے نہیں مل سکا۔ حصۂ اوّل میں مندرجہ کتب کی فہرست سے اسمائے کتب مع اسامی مصنفین سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس فہرست میں ابنِ عربیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، مولانا جامیؒ، شیخ عبدالکریم جیلیؒ، حضرت عبدالوہاب شعرانیؒ، علامہ داؤد قیصریؒ، حضرت شیخ اسماعیلؒ، حضرت شیخ عبدالغنی

Marfat.com

نابلسیؒ اور حضرت شیخ روزبھان البقلی شیرازیؒ کے نام ملتے ہیں۔

حقیقتِ انسانی کی اصل حقیقتِ محمدیؐ ہے۔آپؐ خدا کا وہ نور ہیں جو سب سے پہلے چمکا اور جس سے تمام کائنات کی تخلیق ہوئی۔آپؐ اُن اسما وصفات کا اجمال ہیں جن کا ظہور کائنات میں ہوا۔آپؐ اللہ کا وہ نور ہیں جو اسمائے صفات کے ظہور سے پہلے درخشاں ہوا۔دراصل وہ قطب جس پر احکامِ عالم کا دارومدار ہے اور جو ازل سے ابد تک دائرۂ وجود کا مرکز ہے حقیقت میں ایک ہی ہے اور وہ حقیقتِ محمدیؐ ہے۔(۱۱)

قبلہ امام جلویؒ نے اس حقیقت الحقائق کے متعلق اپنی دوسری تصنیف ''اسرارالمقطعات'' میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''انسانِ کامل کے آئینہ میں کمالاتِ خداوندی کا ظہور ہے اس لیے کہ جو نقش ونگار آئینہ میں ظاہر ہوتے ہیں وہ آئینہ کے نہیں بلکہ آئینہ والے کے ہوتے ہیں۔''(۱۲)

Marfat.com

حواشی

1) قبلہ امام جلوی پیر غلام محمد، مولف ومترجم، ''تحقیق العارفین''، لاہور: اشرف پریس، س۔ن، ص۲۔
2) ایضاً۔ ص۵-۶۔
3) ایضاً۔ ص۳۰۱۔
4) ایضاً۔ ص۳۰۴۔
5) ایضاً۔ ص۷۱-۷۲۔
6) ایضاً۔ ص۷۵۔
7) ایضاً۔ ص۲۰۷۔
8) ایضاً۔ ص۲۰۹۔
9) ایضاً۔ ص۹۷۔
10) ایضاً۔ ص۲۹۴-۲۹۵۔
11) یونس خان ایڈووکیٹ ''الہیات، تصوّف اور علم الکلام''، لاہور: خان بک کمپنی، ۲۰۰۱ء، ص۴۷تا۴۹۔
12) قبلہ امام جلوی پیر غلام محمدؒ ''اسرار المقطعات''، لاہور: اشرف پریس، س۔ن، ص۳۴۴۔

Marfat.com

حضرت امام جلویؒ کے صوفیانہ اُردو خطوط

اُردو زبان کو بولی کی سطح سے اُٹھا کر ادبی شکل دینے والے شیخ باجن، خوب محمد چشتی، علی محمد جیو گام دھنی اور قاضی محمود دریائی صوفیہ تھے۔ قدیم صوفیہ نے اُردو زبان کی صلاحیت اور توانائی میں اضافہ کرتے ہوئے اُردو زبان کے عوامی پیکر تراشے اور پھر اس لسانی پیکر میں لوگوں کو ہدایت اور نصیحت کرتے رہے۔ اُن کی زبان کو ممتاز کرنے والی شے اسلام کی حقانیت کے تصورات تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اس بات کی تائید میں لکھا ہے:

> ''اُن ایام میں اُردو زبان کے امتیازی خط و خال جو دوسری زبانوں سے اسے ممیّز کر سکیں، صرف معدودے چند ہیں یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمانی جذبات و خیالات ہوں، اس میں ایک حد تک عربی و فارسی کا عنصر موجود ہو۔''(۱)

دکنی ادب کے ابتدائی دور میں زبان کا ایک منصب صوفیانہ تصورات کا اظہار تھا۔ دکن میں قدیم اُردو کی اشاعت کا سلسلہ مقامی صوفیہ کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ صوفیہ کے یہاں لسانی شعور کے ساتھ فکری سطح بھی موجود ہے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق اور اُن کا خاندان اُردو زبان کے فروغ کا باعث بنا۔ برہان الدین جانمؒ کے فرزند امین الدین اعلیٰ نے نظم و نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ امین الدین اعلیٰ نے اپنے برجستہ فقروں اور سلجھی ہوئی عبارتوں سے اُردو نثر کا انفرادی آہنگ اور لب و لہجہ متعین کیا۔ میراں جی حسن خدانما نے اُردو زبان کو عظیم روحانی اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ صوفیہ کی ان لسانی خدمات کا اعتراف ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کیا ہے۔ وہ مولوی عبدالحق کے رسالے ''اُردو کی نشو و نما میں

Marfat.com

صوفیائے کرام کا کام'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ آغاز میں اُردو کی ترویج میں اُن اربابِ باطن نے بڑا حصہ لیا جن کے مذہبی رسالے اور نظمیں اُردو کے ابتدائی سرمایے میں غالب اکثریت رکھتی ہیں۔''(۲)

اُردو زبان کے فروغ اور ترقی میں نمایاں حصہ صرف قدیم دور کے صوفیہ کا ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں بھی صوفیہ نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت امام جلوی پیر غلام محمد صاحب نہ صرف تصوُّف میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں بلکہ شاعری اور خطوط نویسی میں بھی کمال کے درجے پر ہیں۔ آج ہمارا موضوع اُن کے خطوط ہیں۔ اُن کی تصانیف عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں ہیں۔ امام جلویؒ کی تمام تصانیف کے فکری عناصر وہ ہیں جن کا سرچشمہ اسلامی حکمت اور تصوُّف ہے۔ خطوط کے ذریعے تعلیم وتربیت دینے کا رواج صوفیہ کے یہاں پرانا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے خطوط تصوُّف کی تعلیم کا ذریعہ رہے ہیں مگر وہ فارسی میں ہیں۔ حضرت امام جلویؒ نے نظم ونثر دونوں میں خطوط نگاری کی ہے۔ اُن کی کتاب ''پیامِ جلوی'' کے بائیس خطوط میں پہلے سترہ خطوط منظوم فارسی میں ہیں اور باقی پانچ اُردو نثر میں۔ پہلے چھ منظوم فارسی خطوط کا ترجمہ اُردو میں ہر شعر کے نیچے لکھا ہوا ہے لیکن ہمارا آج کا موضوع اُردو خطوط ہیں۔ حضرت امام جلویؒ کے اُردو خطوط کے مجموعے کا نام درج ذیل ہے:

یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ

المعروف بہ

تعلیمِ توحید ودقیق علوم

تصوُّف چوں کہ ہماری تہذیب میں رچا بسا ہوا ہے اس لیے ہمیں پیر امام جلویؒ کے دو خطوط میں اُردو زبان کا تہذیبی باطن نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر خطوط صرف صوفیانہ دانش کے مظہر ہی نہیں بلکہ ان خطوط نے اُردو کی ترقی اور فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ خط کو ادب بنا کر فن کے اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کا کام شیشہ گری سے کم نہیں، مگر حضرت امام جلویؒ کے خطوط میں یہ شیشہ گری نظر آتی ہے۔

Marfat.com

کامیاب مکتوب نگار کے لیے وسیع المطالعہ ہونا، اپنے مشاہدے کو اپنے وسیع مطالعہ کے تناظر میں دیکھنا اور اپنی معلومات کو تخلیقی انداز میں پیش کرنا ضروری ہے۔ خط میں جامعیت و معنویت پیدا کرنے کے لیے عصری امور و مسائل سے آگاہی اور تنظیم کے لیے نکات کا تعین، ترتیب اور باہمی ربط ضروری ہے۔ (۳)

کامیاب مکتوب نگار میں مذکورہ اوصاف کے علاوہ تجزیاتی صلاحیت اور غیر جانبداری بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ خط لکھتے وقت مکتوب نگار کو جذبات سے کام لینے کے بجائے عقل و شعور سے کام لینا چاہیے۔ مکتوب نگار کا کسی بھی مکتب فکر سے متاثر ہونا عیب نہیں لیکن خط لکھتے وقت اُس کا غیر جذباتی اور غیر جانبدار رہنا بہت ضروری ہے۔ صوفی مکتوب نگار میں مذکورہ بالا تمام خوبیوں کے ساتھ ایک اضافی خوبی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے دروں بینی۔ صوفیانہ روایت میں اتحاد، ہم آہنگی، بے تعصبی اور رواداری کی فضا ہوتی ہے۔ دیر و حرم کی تقسیم نظر نہیں آتی۔ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے تو وہ سلوک کی ایک منزل میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وسعتِ مطالعہ کا تعلق اگر سفر سے جوڑا جائے تو صوفیہ کی زندگی میں سفر کو صداقت کی تلاش کے لیے ضروری گردانا گیا۔ نظم و ضبط اور تنظیم تو صوفیانہ ماحول کا حصہ ہے اور دروں بینی صوفی کا مشغلہ۔ صوفی حقیقتِ اولیٰ کو پانے کے بعد باطنی ربط کی وجہ سے نہ صرف انسانوں سے بلکہ کائنات کی دوسری اشیاء سے خود کو ہمکنار پاتا ہے اس لیے اس کا تجزیہ زیادہ وسعت رکھتا ہے اور بیان جامعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی مثال صوفیانہ مکاتیب اور ملفوظات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

صوفیانہ خطوط میں جب ہم حضرت امام جلویؒ کے اُردو خطوط کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان میں نظم و ضبط، وسیع مطالعہ و مشاہدہ، دروں بینی، تجزیاتی صلاحیت اور عقل و دانش نظر آتی ہے۔ حضرت امام جلویؒ کے اُردو خطوط اگرچہ صوفیانہ ماحول میں خاص صوفیانہ استعداد کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن ان میں ہمیں جمالیاتی رنگ نظر آتا ہے۔ تصوُّف اخلاقیات کا حامل ہوتا ہے اور اخلاق جمال ہی کا ایک روپ ہے اور جمال تخلیق کی بنیاد ہے۔ حضرت امام جلویؒ کے خطوط انسانی جبلت کو با اخلاق بناتے اور جذبے کی تہذیب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور انھوں نے جذبے کی تہذیب کے ذریعے خلقِ خدا کو جذبے کی بربریت اور تشدد سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔

Marfat.com

دوسروں کے عیب تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیبوں پر نظر رکھنے اور عجز وانکسار اختیار کرنے کی تلقین اپنے چہیتے مرید اور خلیفہ کو ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''اپنے نفس کے عیب دیکھ لینا کشفِ کُبریٰ میں داخل ہے۔ خدا جس کو پاک اور اپنی ذات کے لیے خاص کرنا چاہتا ہے اُسے اپنے عیوب پر مطلع کر کے توبۂ خالص کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ عیب، عیب نہ دکھائی دے بلکہ ہُنر معلوم ہو۔ اے عزیز! جو چیز وسوسہ میں ڈالے وہ گناہ ہے گو بظاہر نیکی ہو۔ جانِ مَن حق سبحانہ اپنے نیک بندوں کو لغزش کے بعد راہِ راست پر اس لیے لاتا ہے کہ وہ پارسائی کے غرور اور بے خطائی و پرہیز گاری کے فخر سے محفوظ ہو کر اپنے عجز وانکسار کے باعث اُس کی ربوبیت کا اقرار کریں۔ لہٰذا آپ دل کی زمین میں وہم کا تخم نہ بوئیں بلکہ محافظتِ الٰہی اور توفیقِ خداوندی کا شکریہ ادا کریں۔''(۴)

نفس کے جہاد کو تصوُّف میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور تصوُّف نفس کی گہرائی میں جھانکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ نفس کی گہرائی میں اترنے کے لیے اپنی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور فن بھی اپنی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''فن اپنی طرف لوٹنے کا ایک وظیفہ ہے، اندر کے اَن دیکھے جہان کو صورت پذیر کرنے کی ایک کاوش ہے۔''(۵)

ادیب جتنا اپنے نفس کو صورت پذیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، اُتنا ہی اعلیٰ متصور ہوتا ہے۔ حضرت امام جلویؒ کے خطوط میں نفس کی گہرائی میں جھانکنے کی ترغیب ہے۔ صوفی جب اپنے نفس میں جھانک کر حقیقت کی آگہی کو لفظوں میں متشکل کرتا ہے تو وہ تخلیق کے عمل سے گزرتا ہے اور خارج کو بھی داخل ہی کا ایک رنگ بنا دیتا ہے۔ اسی قسم کی تخلیقی کیفیت زیرِ نظر خطوط میں دکھائی دیتی ہے مگر تخلیقی زندگی صرف شعر وادب ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زندگی ہے جس میں انصاف ومحبت کی اقدار ہوتی ہیں کیوں کہ کائنات کا وصف خیر ہے اور خیر کے ادراک کے بغیر زندگی بدشکل اور بنجر بن جاتی ہے۔ خیر کی یہ مثبت اقدار زندگی کی خوبصورتی کی ضامن ہیں اور تصوُّف میں تعلیم وتربیت

Marfat.com

کا حصہ ہیں۔صداقت جیسی مثبت اقدار صوفیہ میں ہی دیکھی جاسکتی ہیں۔حضرت امام جلویؒ ایک سائل کے سوالوں کے جواب میں ایک طویل خط میں نکتہ چیں اور نکتہ داں کا فرق واضح کرتے ہوئے دوسروں پر نکتہ چینی کی مذمت کرتے ہیں:

''اے عزیز! عوام الناس نکتہ چین اور حق شناس نکتہ داں ہوا کرتے ہیں۔ نکتہ چین ہزار ہنر کو چھوڑ کر ایک عیب کا متلاشی ہوتا ہے۔بُرے لوگ اچھی باتوں میں بھی بُرا پہلو تلاش کر لیتے ہیں جیسا کہ مکھیاں تمام خوبصورت جسم کو چھوڑ کر صرف زخم ہی پر بیٹھتی ہیں اور نکتہ داں ہزار عیب کو نظر انداز کر کے ایک ہنر پر نگاہ رکھتا ہے۔خاصہ جو شخص بحکم آیۂ لَا تَجَسَّسُوْا سے عیبِ خُود بیں عیب بیگانہ مُبیں پر عمل پیرا ہوتا ہے..... پس کسی کی نکتہ چینی کے بجائے خود کو مجسمۂ خطا سمجھ کر بابِ رحمت الٰہی کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔''(۶)

سرسید اور اُن کے رفقا نے اُردو نثر میں جس مقصدیت کو اجاگر کیا وہ مقصدیت ہمیں زیرِ نظر خطوط میں نظر آتی ہے۔ جب حضرت امام جلویؒ اپنے مرید کو سماجی ذمہ داری سے گریز نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

''عزیزِ من! جس کام کا نتیجہ حصولِ مراتبِ اُخروی بلکہ رضائے خداوندی ہو، وہ کارِ دُنیا نہیں بلکہ کارِ خدا ہے کیوں کہ جس تعلیمِ خاص کی بنا پر آپ کو کارِ سرکار میں لگایا گیا ہے اُس کا نام طاعتِ الٰہی ہے نہ کہ دُنیا کا کام۔باقی رہی افسرانِ بالا کی رنجش وغیرہ سو مرضیاتِ الٰہی میں اہلِ دُنیا کی تکالیف و ایذا کا برداشت کرنا مردانِ خدا ہی کا فرضِ منصبی ہے۔''(۷)

مذکورہ جواب اپنے مرید کے اپنی سرکاری ملازمت کو 'محال' لکھنے پر دیا گیا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔گویا مشاورت کا عمل بھی خطوط میں دکھائی دیتا ہے۔حضرت امام جلویؒ کے خطوط میں تصوُّف کا پورا نظامِ فکر موجود ہے جو نہ صرف مریدوں کی تعلیم و تربیت میں معاون ہے بلکہ یہ اندازِ فکر اولاد کی تربیت میں بھی نظر آتا ہے۔بڑے بیٹے پیر محمد انوار حسین صاحب کے نام

Marfat.com

خط میں جو دعائیں دی ہیں، وہ بھی اسی عارفانہ اندازِ فکر کو ظاہر کرتی ہیں۔ بیٹے کو مخاطب کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''بعد دُعائے جان و ایمان و عشق و عرفان کے واضح ہو کہ دل تجلی گاہِ الٰہی ہے۔ اسے یادِ الٰہی میں شاد رکھا کریں اور غموں سے آزاد۔ حمدِ اللہ کہ محبت آپ کی فطرت ہے۔ البتہ حصولِ علم و عرفان میں حتی الوسع کوشاں رہیں تا کہ عشق و علم و عرفان کا کمال حاصل ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا دل توحید کے نغموں سے سرشار اور مخمور رہے اور آپ کی توجہ ہر دم حق سبحانہ کی جانب مبذول رہے اور آپ کا دل اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کہیں قرار نہ پکڑے۔ آپ کا کھانا فضلِ خداوندی اور آپ کا پینا شرابِ ذوق و خورسندی ہو۔ رضا بالقضا آپ کا لباس ہو اور آپ کی بصر و بصیرت حق بیں و خدا شناس ہو۔ تن خدمتِ اسلام میں اور دل محبتِ ذُوالجلال وَالاِکرام میں اور رُوح وصالِ خداوندی کے مقام میں ہو۔ آپ کی ہمت بلند اور آپ کا ہر فعل و عمل خدا کو پسند ہو۔ آپ کا دل غیرِ حق سے خالی اور آپ کی روح کا مقام عالی ہو۔ آپ کا مقصد ربانی اور منزل سُبحانی ہو۔ آپ دُنیا میں میری آنکھوں کا نور اور آخرت میں میری جان کا سرور اور خدا کو منظور ہوں۔''(۸)

حضرت امام جلویؒ کے خطوط تصوُّف کے اسرار کا خزانہ ہیں۔ تصوُّف کے تقریباً تمام موضوعات کا احاطہ خطوط میں موجود ہے۔ جیسے عشق، وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ۔ خط میں فرماتے ہیں: ''اے عزیز وحدتِ شہود ایک دیکھنا اور وحدتِ وجود ایک ہونا ہے۔ پس ایک دیکھنا کہاں اور ایک ہونا کہاں۔ بادشاہ کا دیکھنا اور ہے اور خود بادشاہ ہو جانا اور۔''(۹)

''رَضا بالقضا'' کو بزرگانِ دین کا شیوہ اور ''موافقتِ تقدیر'' کو اُن کا مشغلہ قرار دیتے ہیں۔ تصوُّف میں پیر یا شیخ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ پیر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے سائل کے سوال کا جواب خط میں دیتے ہیں:

Marfat.com

''کوئی ہزار سال بھی کیوں نہ صحبتِ صوفیہ میں رہے لیکن جب تک اپنے علم وعقل کو شیخ کے قدموں پر نثار نہ کرے، سرِ حقیقت سے ہرگز آگاہ نہیں ہوسکتا۔ نیز انکشافِ حقیقت افضالِ خداوندی پر منحصر ہے۔ چاہے تو بسترِ استراحت پر دولتِ ابدی بخش دے نہ چاہے تو عمر بھر خاک چھاننے سے بھی گوہرِ مقصود نہیں ملتا اور عنایتِ الٰہی شاملِ حال ہو تو شیخِ کامل کی ایک ہی نظر کافی ہوسکتی ہے اور قلیل عرصہ میں ایسے اسرارِ جلیل منکشف ہوتے ہیں جن کا شکریہ ابدآباد تک ادا نہیں ہوسکتا۔''(۱۰)

صوفیانہ سوالات کے جوابات عارفِ کامل کی زبانی سننے میں جو لطف ہے وہ حضرت امام جلویؒ کے خطوط میں صاف نظر آتا ہے خصوصاً جب مکتوب نگار عارفِ کامل ہونے کے ساتھ صاحبِ حال بھی ہو تو جوابات میں تشنگی نہیں رہتی۔ زیرِ نظر خطوط میں بعض جوابات کی تفصیل کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ تصوُّف کے فکری پہلوؤں کی وضاحت میں بڑے بڑے صوفیہ کے حوالے اور اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط جمالیاتی سطح پر قاری کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہنی افق کو بھی کشادہ کرتے ہیں۔ زمانی ترتیب کے بغیر ایسے صوفیہ کے نام درج کیے جاتے ہیں جن کے حوالے خطوط میں نظر آتے ہیں۔

(۱) حضرت غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
(۲) حضرت عبدالکریم جیلیؒ
(۳) حضرت مجدد الف ثانیؒ
(۴) ابنِ عربیؒ
(۵) شیخ شہاب الدین بن حجر المکیؒ
(۶) سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ
(۷) حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ
(۸) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
(۹) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

Marfat.com

(۱۰) شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

(۱۱) امام شعرانیؒ

(۱۲) امام فخرالدین رازیؒ

(۱۳) حضرت داتا گنج بخش الہجویریؒ

(۱۴) پیر مہر علی شاہؒ

(۱۵) خواجہ غریب نواز اجمیریؒ

(۱۶) مولانا رومؒ

(۱۷) بوعلی شاہ قلندرؒ

چوں کہ صوفی کو شعورِ ذات حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی جہت کے تعین پر بھی قادر ہوتا ہے اس لیے اس کی تحریر میں ایک خاص رفتار اور حرکی قوت نظر آتی ہے۔ اسی خاص رفتار اور حرکی قوت کا مشاہدہ ہم حضرت امام جلویؒ کے خطوط میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے صوفیانہ مکاتیب میں صوفیانہ دانش کا اظہار کرتے ہوئے ہمعصر احباب کے سوالات کے جواب بڑے تحمل سے دیتے ہیں۔ ان جوابات میں عصری امور کی آگہی نظر آتی ہے۔ سات سوالوں پر مشتمل ایک طویل خط کے پانچویں سوال کا جواب ملاحظہ فرمایئے:

> ''بھائی جان! اعمال و اخلاق کی خرابی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ بھلا جو حالت اس دورِ انقلاب میں مسلمانوں کی ہوئی ہے اور ہمیں اپنے اعمالِ بد کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے اس کے بعد آج کل کے نرالے مہاجرین و انصار میں سے کسی نے کچھ عبرت بھی حاصل کی ہے؟ نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ہمارے اخلاق ردّی اور اعمال بدتر ہو گئے ہیں۔ یہ صرف تاجدارِ مدینہ رحمتہ للعالمینؐ کی ذاتِ گرامی کا صدقہ ہے اور آپؐ کے سچے متبعین و اولیائے کاملین کے وجود کی برکت سے باوجود اتنی پرکاری کے ہم عذابِ الٰہی سے محفوظ اور مامون ہیں۔''(۱۱)

حضرت امام جلویؒ کے نثر میں اُردو خطوط کا مجموعہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ

Marfat.com

میں اولاد، مریدوں اور اُس وقت کے عالموں کے نام خطوط ہیں۔ ان خطوط میں القابات میں حفظِ مراتب کا خیال رکھا گیا ہے۔ مریدوں کے لیے محبّ پروردگار، عاشقِ سبحان، عزیز از جان، صادق الیقین، راسخ الایمان، محبّ دلنواز اور محرمِ راز جیسے القابات ہیں۔ دوسرے مجموعہ ''پیامِ جلویؒ'' کے اُردو خطوط پیرومرشد کو لکھے گئے ہیں، لہٰذا مخاطب کرتے ہوئے القابات بھی پیرومرشد کے مقام کی مناسبت سے استعمال کیے ہیں جیسے ''حضورِ پرنور''، ''قبلہ عالمیان وکعبۂ دوجہان''، ''بخدمتِ حضور نورٌ علیٰ نور''، قبلۂ کونین وکعبۂ دارین''، ''مرشدِ حقیقی وکعبۂ تحقیقی''، ''حضرت پیردستگیر روشن ضمیر بدرمنیر''، ''سید العارفین امام الواصلین محبوب رب العالمین'' وغیرہ۔

پیامِ جلویؒ کے خط نوزدہم میں جوشِ محبت میں لکھتے ہیں:

> ''اے قبلۂ ایمانِ من، اے کعبۂ دلجانِ من، اے جانِ جانانِ من، اے یارِ دلرنجانِ من، اے گلِ خندانِ من، اے غنچۂ دہانِ من، اے ساقیِ مستانِ من، اے پیرِ عالیشانِ من، میرا دل آپ کی مدحت کا نسخہ اور میری زبان آپ کی نعت کا ورقہ اور ہر رگ آپ کی ثنا کا جدول اور ہر بال آپ کی دعا کا مصرع ہے۔''(۱۲)

پیرومرشد کی محبت میں ڈوبا ہوا یہ خط ۱۱۱ اپریل ۱۹۲۸ء بروز بدھ لکھا گیا۔ خط طویل ہے اور مذکورہ عبارت خط کے درمیان سے ہے۔

حضرت امام جلویؒ کے خطوط صرف وعظ ونصیحت پر مبنی نہیں اور نہ ہی صرف صوفیانہ نکات کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ اُردو نثر میں فنی لحاظ سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ پیامِ جلویؒ کے نثر میں لکھے ہوئے اُردو خطوط میں ہم خوبصورت شاعرانہ نثر کے نمونے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ 'خط بست ویکم' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''سحابِ رحمت کی گھٹا چھا رہی ہے۔ جنابِ عزت سے ندا آ رہی ہے۔ میخانۂ وحدت کا در کھلا ہے۔ شرابِ محبت کا جام پُر ہے۔ نشۂ توحید کی کیفیت طاری ہے۔ هَلْ مِنْ مَّزِیْد کی آواز جاری ہے۔ بے نیازی کا تاج برسر ہے۔ عشقبازی کی خلعت دَر بر ہے۔ شادمانی عشق ومستی میں

Marfat.com

ہے۔ خدادانی بت پرستی میں ہے۔ زندگانی فراخ دستی میں ہے۔ یار جانی ہماری ہستی میں ہے۔ ہم حضرتِ عشق کے دیوانے ہیں۔ ہم شمعِ حُسن کے پروانے ہیں۔ ہم اسرارِ حق کے خزانے ہیں۔ اے یار یہ سب مستی کے ترانے ہیں۔ خونِ جگر ہماری غذا ہے۔ دردِ دل ہماری دوا ہے۔ آپ کے حق میں جو کہوں سو روا ہے۔ زبان میں تیری گفتگو ہے۔ دل میں تیری جستجو ہے۔''(۱۳)

حضرت امام جلویؒ کے اُردو خطوط تصوُّف کی تعلیمات سے پُر ہونے کے ساتھ اُردو نثر کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ اُردو نثر کی ترویج و ترقی میں ان خطوط کا اہم رول ہے۔ ان میں صرف ذاتی مسائل کا ذکر نہیں بلکہ انسانی مسائل کی بات ہے۔ انسانی کردار کو سنوارنے کے لیے تزکیۂ نفس کی ترغیب ہے اور پھر روحانی بیماریوں کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

حواشی

۱) ڈاکٹر جمیل جالبی، ''تاریخِ ادبِ اُردو'' جلد اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۸۔
۲) ڈاکٹر سید عبداللہ، ''اُردو زبان کی تعمیر میں مسلمانوں کا خاص حصہ'' مشمولہ ''اُردو زبان اور ہماری ثقافت''، ناشر ملک نذیر احمد، لاہور: تاج بک ڈپو، بارِ اوّل: ۱۹۶۶ء، ص ۴۹۔
۳) ڈاکٹر مسکین علی حجازی، ''مکتوب نگاری'' طبع دوم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۹۶، ۹۸، ۱۰۲۔
۴) امام جلوی پیر غلام محمد صاحب، ''یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ'' لائل پور: جلوی کتب خانہ، مطبوعہ اشرف پریس، لاہور: تاریخ اشاعت ربیع الثانی شریف ۱۳۸۴ھ، ص ۴۴۔
۵) ڈاکٹر وزیر آغا، ''معنی اور تناظر'' سرگودھا: مکتبۂ نردبان، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۔
۶) امام جلوی پیر غلام محمد صاحب، ''یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ'' ص ۷۹۔
۷) ایضاً۔ ص ۳۲۔ ۸) ایضاً۔ ص ۱۲۔
۹) ایضاً۔ ص ۱۷۲۔ ۱۰) ایضاً۔ ص ۱۷۴۔ ۱۱) ایضاً۔ ص ۲۴۵۔
۱۲) امام جلوی پیر غلام محمد صاحب جلوؔ آنوی ''پیامِ جلوی''، لاہور: اشرف پریس، ۱۳۸۲ھ، ص ۹۱-۹۲۔
۱۳) ایضاً۔ ص ۹۶-۹۷۔

Marfat.com

صوفی عطاؒ محمد قادری کے صوفیانہ تراجم

ترجمہ عالمگیر سچائیوں کو کھوجنے اور پہچاننے میں مددگار ہوتا ہے اور صوفیانہ تراجم نے تو مخفی دنیاؤں کو دریافت کر کے لوگوں سے متعارف کرایا۔ انسان کو انسان دوستی پر آمادہ کرتے ہوئے آدمی کو انسان اور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلایا۔ صوفیانہ تراجم نے محدود خول میں بند آدمی کو لامحدود دنیا سے آشنا کر دیا، عام آدمی کو انسانِ کامل بننے کی ترغیب دی اور بتایا کہ ذرّہ سے آفتاب کیسے بنا جا سکتا ہے۔ صوفیانہ تراجم کے ذریعے سے ہی ہم اپنے عظیم تہذیبی ورثے سے دنیا کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ (۱)

صوفیانہ تراجم کے ذریعے صوفیہ نے اُردو کو تہذیبی سطح پر ایک نیا تناظر فراہم کیا۔ ترجمے کی قدیم روایت کے سلسلے میں دکن اور گجرات کے صوفیہ شیخ عین الدینؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، برہان الدین جانمؒ، عبداللہ حسینی اور سید حسینی شاہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ شیخ عین الدینؒ نے ۲۳۱ کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں۔ عبداللہ حسینی کا ترجمہ ''نشاط العاشقین'' اہم ہے۔ ابتدائی نثر نگاروں میں میراں جی حسن خدانما کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں ان سے ''شرح تمہیدات'' اور ''شرحِ مرغوب القلوب'' یادگار ہیں۔ نثریہ ترجمے کے سلسلے میں گفتارنامے، خطبات، ملفوظات، اقوال اور نثری رسائل یادگار ہیں۔

صوفیانہ تراجم خیر کی تبلیغ کے لیے تھے۔ اُردو میں ترجمے کی بنیادیں رکھنے والے صوفیہ اچھے کاموں کی تبلیغ اور بُرے کاموں سے باز رکھنے کے جذبے کے تحت دور دراز علاقوں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور صوفیانہ مسلک کی سچائی اور مساوات کے تحت یہاں کے عوام کو فائدہ پہنچایا۔ عربی، فارسی کی نثری اور منظوم کتب کے اُردو میں تراجم اور شرحوں نے اُردو زبان کو

Marfat.com

اُس کے ایامِ طفلی میں ہی اسلوبیاتی سطح پر اظہار کے سانچے فراہم کر دیے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان خانوادہ شاہ ولی اللہ کی عزت وتکریم کی وجہ وہ تراجم ہیں جو شاہ صاحب اور اُن کے صاحبزادوں نے کیے۔ صوفیانہ کتب کے اُردو ترجمے اکثر صوفیہ نے کیے۔ صوفیہ نے ترجمے کے ساتھ عارفانہ نکات کی شرح بھی کی ہے۔ جب صاحبِ متن اور مترجم دونوں صوفی ہوں تو ترجمے کا عمل عشق کا عمل بن جاتا ہے۔ مترجم کو صاحبِ متن سے محبت ہوتی ہے اور محبت کے راستے کی تمام تکلیفیں بھی مترجم کو اٹھانی پڑتی ہیں۔ مترجم کو شرح کرتے وقت روحانی پرواز کے ساتھ تخلیقی پرواز سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ایسے ہی تخلیقی و روحانی پرواز کے حامل اور وحدت الوجود کے مستند مترجم و شارح صوفی عطا محمد قادریؒ کے صوفیانہ تراجم کا ذکر اس مضمون میں کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے کاشفِ اسرار صوفی عطا محمد قادریؒ ۵۱ جنوری ۱۱۹۱ء کو جٹ وڑائچ خاندان میں موضع ہریا والا گجرات میں پیدا ہوئے اور ۹ اپریل ۱۹۸۴ء آپ کی روحِ مقدس کا شہبازِ لامکانی اپنے اصل وطن عالمِ نورانی کی طرف پرواز کر گیا۔ اُن کی تصنیفات کی تعداد دس ہے مگر ہم یہاں اُن کتابوں کا ذکر کریں گے جو ترجمہ وتشریح ہیں۔

(۱) اسرارُ القِدم

اس کتاب کا سالِ اشاعت ۱۳۸۷ ہجری ہے۔ اشرف پریس لاہور سے شائع ہونے والی یہ کتاب ۶۳۶ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ ''اسرارالقدم'' ابنِ عربی کی کتاب ''فصوص الحکم'' کی شرح ہے اس لیے ہر باب کے آغاز میں عربی عبارت بھی دی گئی ہے۔ ''اسرارالقدم'' میں مشکل متصوفانہ اصطلاحات کو سلیس اُردو زبان میں بامحاورہ ترجمہ وتشریح کے ذریعے آسان بنا دیا گیا ہے مگر پھر بھی کئی مقامات پر مشکل محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ترجمہ اس خامی کا سبب نہیں ہے بلکہ صوفیانہ تجربے کی نزاکت بسا اوقات بیان واظہار کی متحمل نہیں ہوتی اور ابہام سامنے آتا ہے۔''(۲)

''فصوص الحکم'' کی زیادہ شروح عربی زبان میں ہیں اور جو اُردو میں ہیں، ان میں پرانی طرز کی اُردو استعمال کی گئی ہے۔ لیکن صوفی عطا محمد قادریؒ نے ''اسرارالقدم'' میں تشریح کرتے ہوئے آسان زبان استعمال کی ہے۔ اس کتاب میں علمِ تصوُّف کے بنیادی معارف اور

Marfat.com

موضوعات ہیں۔موضوعات کی ترتیب میں منطقی اور استدلالی ربط ہے۔''اسرارالقدم'' کے ذریعے خدا اور بندے کے درمیان رابطوں کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔اس کتاب میں وجود کے مختلف مراتب اور سالک کے مقامات کا ذکر ملتا ہے۔صوفی عطا محمد قادریؒ صاحبِ حال بزرگ تھے،اس لیے کتاب میں واردات ومشاہدات کا ذکر ہے۔

''اسرارالقدم'' نے شرح ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔''مراد یہ ہے'' اور ''یعنی'' کی بھرماراس نکتے کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ کتاب صرف ترجمہ نہیں ہے بلکہ شرح درشرح ہے۔یہ علومِ باطنی پر مبنی ایک بھرپور تصنیف ہے اور حال کے قال بننے کی غمازی کرتی ہے۔صوفی مصنف کا کام حقیقتِ عظمیٰ کو بیان کرنا ہے جب کہ لازوال اور لامحدود ہستی کے بارے میں الفاظ دم بخود ہوتے ہیں اور معنی حیران۔ایسے میں وارداتِ قلبی اور مشاہدۂ عینی کا بیان آسان کام نہیں ہے۔ صاحبِ ''اسرارالقدم'' نے وحدت الوجود کے بیان میں کامیابی حاصل کی ہے اور قاری کے ذہن میں ابہام کی گنجایش نہیں چھوڑی۔

(۲) یَنْبُوْعُ الْغَیْب

یہ کتاب جناب غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ''فتوح الغیب'' کا ترجمہ وتشریح ہے۔چارسوصفحات پر مشتمل اس کتاب کو پہلی بار اشرف پریس لاہور نے چھاپا۔ کتاب کے نام کے سلسلے میں صوفی عطا محمد قادریؒ لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ کتاب ''فتوح الغیب'' کی شرح کے لیے اس مسکین کو میرے سلطان غوث الثقلینؒ نے خود ہی نامزد فرمایا ہے اس لیے مجھے یقینِ محکم ہے کہ آں حضور (میری آنکھوں کے نور) اس کتاب کے مطالب اور معانی سمجھنے کے لیے میرے دل میں ایک چشمہ جاری کر دیں گے۔اسی بنا پر اس شرح کا نام ''ینبوع الغیب من فتوح الغیب'' تجویز کیا گیا ہے۔''(۳)

''ینبوع الغیب'' کا دیباچہ اُن معتبر صوفیانہ کتب کے ذکر سے مزین ہے جن میں حضرت غوث الاعظمؒ کا نسب شریف مذکور ہے۔کتاب میں علمِ طریقت کے متعلق جملہ احکام درج ہیں اور کتاب کے مقالات تصوُّف کے مندرجہ ذیل مضامین کے بارے میں ہیں:

Marfat.com

۱۔توکل
۲۔دنیا کی طرف التفات نہ کرنا
۳۔قربِ الٰہی کا حصول
۴۔کشف اور مشاہدہ
۵۔نفس اور اُس کے احوال
۶۔توحید کے مراتب
۷۔مذہب جبریہ اور قدریہ
۸۔قضاوقدرِ الٰہی کو تسلیم کرنا
۹۔نزولِ بلا پر شکایت نہ کرنا
۱۰۔مقامِ استقامت وتمکین
۱۱۔اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنا
۱۲۔شجرۂ ایمان کے پھل صبر ورضا ویقین و موافقت وعلم
۱۳۔اللہ کی صفات جلال اور جمال
۱۴۔موتِ ابدی اور حیاتِ ابدی
۱۵۔حقیقتِ محمد ﷺ
۱۶۔مقامِ بقا اور مقامِ استقامت
۱۷۔اہلِ مجاہدہ ومحاسبہ ومعاہدہ کی دس خصلتیں

صوفی عطا محمد قادریؒ شارح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تخلیقی مترجم بھی ہیں۔صوفی کی قوتِ متخیلہ عام آدمی سے زیادہ فعال ہوتی ہے اس لیے اُس کی تحریر تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ ''ینبوع الغیب'' میں تصوُّف کی اصطلاحات کی وضاحت کے سلسلے میں یہی تخلیقی صورتِ حال ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۳)تفسیرِ رُومیؒ

مولانا روم کی فارسی نثر میں واحد تصنیف رسالہ ''فیہ مافیہ'' ہے۔یہ رسالہ مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کو آپ کے فرزند سلطان بہاؤالدین نے مرتب کیا۔''فیہ مافیہ'' کا اُردو میں ترجمہ ''ملفوظاتِ رومی'' کے نام سے عبدالرشید تبسم نے جون ۲۰۰۰ء میں کیا۔یہ ترجمہ مکتبہ جدید پریس لاہور سے شائع ہوا۔''ملفوظاتِ رومی'' میں مضامین کے اعتبار سے عنوان مقرر کر دیے گئے ہیں اور ہر فصل کو متعدد پیروں میں توڑ دیا گیا ہے۔''ملفوظاتِ رومی'' کے مصنف کے مطابق ''فیہ مافیہ'' کی عبارت کئی مقامات پر ٹیلیگرافک قسم کی عبارت ہے جس کا مفہوم واضح نہیں۔''(۴)

صوفی عطا محمد قادریؒ نے مذکورہ ملفوظات کو تفسیرِ قرآن مجید کی طرز پر جمع کر کے سلیس اُردو زبان میں ترجمہ کر دیا ہے اور اس کا نام ''تفسیرِ رومی'' رکھا ہے۔اس ترجمہ میں ملفوظات کی

Marfat.com

ترتیب ''ملفوظاتِ رومی'' سے مختلف ہے۔ ''تفسیرِ رومی'' ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۸۶ھ میں شائع ہوا۔ مصنف نے سببِ تالیف بیان کرنے کے بعد فہرستِ آیات مندرجہ تفسیرِ رومی بھی دی ہے۔ اس فہرست میں ۵۶ سورتوں کے نام ہیں جن سے ''تفسیرِ رومی'' میں مندرجہ آیات لی گئی ہیں۔

''تفسیرِ رومی'' ایسا ترجمہ ہے جس میں صوفیانہ شان ملتی ہے۔ صوفی عطا محمد قادریؒ چوں کہ خود باکمال صوفی تھے اس لیے ''تفسیرِ رومی'' میں ایک صوفی کے فکر کو دوسرے صوفی نے بڑی خوبی سے منتقل کیا ہے۔ مترجم انسان دوست ہونے کی وجہ سے کلاسیکی ہوتا ہے اور ترجمے کے باطن میں بھی کلاسیکیت ہوتی ہے۔ مترجم اور وہ بھی صوفی مترجم ابدی قدروں کا علمبردار بھی ہوتا ہے۔ ''تفسیرِ رومی'' میں کلاسیکی انداز ہے کیوں کہ تصوُّف ابدیت کا حامل ہے اور ''تفسیرِ رومی'' کے مضامین صوفیانہ ہیں اور ایک کامل صوفی سے بڑھ کر ان مضامین کی ترجمانی کون کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی عطا محمد قادریؒ نے مولانا روم کی ''فیہ مافیہ'' کے ملفوظات کا ابہام دور کر دیا ہے کیوں کہ ''تفسیرِ رومی'' میں صوفی مترجم کا جذبۂ دروں شامل ہے۔ (۵)

کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کر سکتا ہے جسے اس کے موضوع سے شغف ہو۔ کسی شاعر کو فلسفے کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ترجمہ سمجھ لینے اور سمجھا دینے کا نام ہے اور جو شخص کسی متن کو خود نہیں سمجھتا وہ کسی کو سمجھانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب ایک صوفی کسی صوفیانہ کتاب کا ترجمہ کرتا ہے تو اُس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ صوفی چوں کہ صوفیانہ مضامین خود سمجھتا ہے اس لیے اُس کا ترجمہ قال میں حال کا رنگ لیے ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ہمیں ''تفسیرِ رومی'' میں دکھائی دیتی ہے۔ (۶)

حال جب قال میں ڈھلتا ہے تو تیقن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جیسے ''تفسیرِ رومی'' کے یہ جملے:

> ''میں کہتا ہوں کیوں عشق بلا صورت متصور نہیں ہے بلکہ صورتوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ صد ہزار صُور کیا علمی کیا عینی عشق سے پیدا ہو جاتی ہیں۔'' (۷)

Marfat.com

(۴) بغدادی گلشن

۹۶صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت امام حسینؒ کی تصنیف ''مرآۃ العارفین فی ملتمس زین العابدینؒ'' کی شرح ہے۔ ''مرآۃ العارفین'' حضرت امام حسینؒ کی وہ تصنیفِ لطیف ہے جو اُنھوں نے اپنے فرزند دلپسند حضرت امام زین العابدینؒ کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمائی ہے۔

صوفی عطا محمد قادریؒ نے ''مرآۃ العارفین'' کی شرح اپنے پیرومرشد حضرت جناب پیر غلام محمد صاحب کے بلند ادراک کے توسّط سے لکھی اور اُن کے حکم پر لکھی۔ کتاب کا نام بھی اُنہی کے حکم پر رکھا گیا۔ ''بغدادی گلشن'' میں صوفی عطا محمد قادریؒ اپنے پیرومرشد جناب غلام محمد صاحب اور دادا پیر سید شیر محمد صاحب گیلانی کی ''مرآۃ العارفین'' سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے پیرومرشد حضرت امام جلویؒ کو کتاب ''مرآۃ العارفین'' ساری کی ساری زبانی یاد تھی۔ گاہے بگاہے مجالس میں جناب ''مرآۃ العارفین'' کی شرح فرمایا کرتے تھے۔ حضور پُرنور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پیرومرشد قبلہ وکعبہ اعلیٰ حضرت جناب پیر سید شیر محمد صاحب گیلانی والیِ فتح پور شریف ''مرآۃ العارفین'' کا درس دیا کرتے تھے اور جناب کو اس کتاب سے اتنی محبت تھی کہ رات کو سونے کے وقت کتاب کو سینۂ مبارک پر رکھ کر سویا کرتے تھے۔ میرے حضور قبلہ پیر امام جلویؒ نے فرمایا کہ ہم نے ساری کتاب ''مرآۃ العارفین'' کا خلاصہ ایک نقشہ کی صورت میں تیار کیا جس کی شکل گلدستہ کی سی تھی اور وہ نقشہ قبلہ وکعبہ اعلیٰ حضرت جناب قطب الاقطاب پیر سید قطب علی شاہ صاحب بخاری والیِ سندھیلیانوالی شریف کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ آپ نقشہ کو دیکھ کر رو پڑے اور زبان دُرفشاں سے فرمایا ''مرآۃ العارفین'' وہ کتاب ہے جس کا ایک حرف بھی علمائے کرام نہیں سمجھتے اور آپ نے اس کتاب کا ایک پھول بنا دیا ہے۔ (۸) نیز فرمایا ''کتاب نہج البلاغت'' کی چھان بین جیسے ہم نے کی ہے کسی اور نے نہیں کی اور ''مراۃ العارفین'' کی چھان بین جیسے آپ

Marfat.com

نے کی ہے آج تک کسی نے نہیں کی۔''(۹)

''بغدادی گلشن'' کی ترجمے کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شارح نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیر و مرشد سے علم حروف پڑھا ہے اور حروف کی اشکال سے معانی، حروف کے اعداد سے معانی اور حروف کے مخارج سے معانی اِستنباط کرنا سیکھا ہے۔ صوفی صاحب نے کتاب میں طالبانِ اسرار کو سمجھانے کے لیے اور صوفیانہ مسائل کی وضاحت کے لیے دائرے اور نقشے پیش کیے ہیں۔ صوفیانہ اصطلاحوں کے سلسلے میں عام فہم اور آسان مثالیں دی ہیں۔

صوفی عطا محمد قادریؒ کو صوفیانہ مسائل کے بیان میں جو کمال حاصل ہے، وہ کمال ہم ترجمہ اور شرح میں بھی دیکھتے ہیں۔ عالم کی صورت پر ذاتِ حق کا ظہور ہے لیکن ذاتِ حق کا ظہور ہر شے، ہر تعین اور ہر انسان میں استعداد کے مطابق ہے۔ اس بات کی شرح کرتے ہوئے صوفی عطا محمد قادریؒ لکھتے ہیں:

> ''آفتاب سارے عالم پر یکساں چمک رہا ہے۔ مساجد پر بھی چمک رہا ہے اور منادر پر بھی چمک رہا ہے۔ ہر مکان پر چمک رہا ہے لیکن کسی مکان میں روشنی تھوڑی ہے اور کسی میں زیادہ ہے۔ اگر مکان میں آفتاب کی شعاعیں کسی روشندان کے ذریعے داخل ہو رہی ہیں تو روشنی تھوڑی ہے۔ اگر شعاعیں کسی دروازے کے ذریعے داخل ہو رہی ہیں تو روشنی زیادہ ہوتی ہے لیکن اگر کسی مکان کی چھت اُڑ جائے تو آفتاب پورے کا پورا اُس مکان میں چمکتا ہے۔''(۱۰)

صوفیانہ اصطلاحوں کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا لیکن صوفی صاحب نے اپنی اس کتاب میں عام فہم اور آسان مثالیں دے کر سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ جیسے وحدت الوجود کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''موجیں اور ٹھاٹھیں دریا سے پیدا ہو رہی ہیں اور پھر اُسی کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ شعاعیں آفتاب سے پیدا ہوتی ہیں اور غروب کے وقت سب

Marfat.com

آفتاب سے مل جاتی ہیں۔''(۱۱)

صوفیانہ ادب میں ''بغدادی گلشن'' کی خاص اہمیت ہے۔علمِ حقیقت کی حامل اس کتاب کو ادبی دنیا میں پہلی بار متعارف کرایا جارہا ہے۔کتاب مختصر مگر تصوُّف کے بڑے گہرے اور باریک مسائل پر روشنی ڈالتی ہے،اس لیے کتاب کو باریک بینی کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔

(۵)تفسیر برزخ جامع

۱۱۲صفحات پر مشتمل یہ کتاب حقیقتِ محمدیہ ؐ کی تفسیر بے نظیر ہے جو علماء اور اولیاء اللہ کے علوم و مکاشفات پر مبنی ہے۔کتاب میں صوفیانہ کتب کے اقتباسات درج کر کے ترجمہ وتشریح کی گئی ہے۔

صوفی عطا محمد قادریؒ نے اس تفسیر کو بالکل نئی تفسیر کہا ہے اور کہا ہے کہ اُنہوں نے قرآن مجید کے مطالب اور معانی،حقائق اور رموز اپنے پیرومرشد سلطان العارفین مولانا غلام محمد صاحب قبلہ جلوآنویؒ کے درِ دولت سے حاصل کیے ہیں۔مصنف کے مطابق قرآن مجید اور حدیث شریف کے مطالب سوائے علمائے ربانی یعنی فقرائے کاملین کے کوئی نہیں جانتا۔(۱۲)

پروفیسر سید خیال بخاری کا خیال ہے کہ:

''ترجمہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ترجمہ کے لیے نہ صرف اپنی زبان پر حاوی ہونا ضروری ہے بلکہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہے،اس پر بھی اسے عبور حاصل ہونا چاہیے اور پھر ترجمہ کرتے وقت اسے نہ صرف اپنی زبان کے بہتر سے بہتر لفظ تلاش کرنا پڑتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اصل مصنف یا مؤلف کی زبان،محاورہ،معنی اور روح کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔اسی لیے بعض لوگوں کے نزدیک ترجمہ کا کام تصنیف سے بھی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اسے اپنی زبان میں درست طور پر اظہار کے بوجھ کے علاوہ اصل مصنف کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔اس کے دل و دماغ اور روح میں بھی جھانکنا پڑتا ہے۔''(۱۳)

صوفی عطا محمد قادریؒ میں بطور مترجم مذکورہ خوبیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔عربی،فارسی

Marfat.com

دونوں زبانوں میں اُن کی واقفیت محض لغت کی سطح پر ہی نہیں بلکہ وہ ان دونوں زبانوں کی روایت سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اُن کے صوفیانہ ترجمے انسانی شعور کی ترقی میں اور تہذیبی نشو ونما میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں اور تخلیقی پہلو بھی رکھتے ہیں۔

Marfat.com

حواشی

۱) ڈاکٹر نفیس اقبال، ''صوفیانہ ترجمے'' مشمولہ ماہنامہ ''شام وسحر''، لاہور: جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۔

۲) ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر، پیش لفظ ''جنید بغداد''، مترجم: محمد کاظم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۔

۳) عطا محمد، ''ینبوع الغیب من فتوح الغیب''، لاہور: اشرف پریس، بارِ اوّل، س۔ن، ص ۳، ۴۔

۴) عبدالرشید تبسم، مترجم ''ملفوظاتِ رومی'' ترجمہ ''فیہ مافیہ''، مولانا جلال الدین رومیؒ، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع پنجم: جون ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۔

۵) ڈاکٹر نفیس اقبال، ''کاشفِ اسرار'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۸۔

۶) مذکورہ حوالہ، ص ۱۱۹۔

۷) صوفی عطا محمد قادریؒ، مترجم: ''تفسیر رومی'' لاہور: اشرف پریس، پہلا ایڈیشن، ۱۳۸۶ھ، ص ۱۲۶۔

۸) صوفی عطا محمد قادریؒ، ''بغدادی گلشن''، فیصل آباد: دربار حضرت پیر امام جلویؒ، بارِ اوّل: ۱۹۸۰ء، ص ۴۸۔

۹) مذکورہ حوالہ۔

مذکورہ حوالہ۔ ص ۳۶۔

۱۱) مذکورہ حوالہ۔ ص ۱۵۔

۱۲) صوفی عطا محمد قادریؒ، ''تفسیرِ برزخ جامع'' لاہور: اشرف پریس، ۱۳۸۶ھ، ص ۱۵۔

۱۳) سید خیال بخاری، ''ہمارے لسانی مسائل'' لاہور: بساطِ ادب، بارِ اوّل، ۱۹۸۷ء، ص ۴۰-۴۱، ۵۲۔

Marfat.com

مقدمہ اسرارُ القِدم مِن فصوص الحکم

کالج میں زیرِ تعلیم تھی کہ والد صاحب (جناب صوفی عطا محمد صاحب قادریؒ) نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ جلد کروانے کے بعد مجھے عنایت کیا اور فرمایا ''بیٹا یہ کتابیں اپنے پاس سنبھال کے رکھ لو۔'' اِس عطا کی اُس وقت تو سمجھ نہ آئی۔ ایم اے اُردو کرنے کے دوران میں نے استادِ محترم سید سجاد باقر رضوی کو والد صاحب کی کتاب ''اسرارُ القِدم مِن فصوص الحکم'' دی تو اُسی زمانے میں سراج منیر نے اُستادِ محترم سے لے کر مذکورہ کتاب پڑھی تو متاثر ہو کر کہا ''میں نے ابنِ عربیؒ کی فصوص الحکم کے بہت سے تراجم اور شرحیں پڑھی ہیں مگر اسرار القدم سے بہتر شرح میری نظر سے نہیں گزری۔'' کتاب پڑھنے کے بعد سراج منیر نے والد صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اگرچہ سراج منیر کی والد صاحب سے ملنے کی خواہش تو پوری نہ ہوئی مگر جب وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر بنے تو اُنھوں نے والد صاحب کی کتابوں کا مکمل سیٹ ادارہ کی لائبریری کے لیے منگوایا۔ اُستادِ محترم کو دی ہوئی کتاب سراج منیر کے توسط سے جی سی یونیورسٹی لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر طارق حسین زیدی کے پاس پہنچی۔ وہ بھی مذکورہ کتاب کے بارے میں سراج منیر کے ہم خیال ہیں۔ اب ''اسرارُ القِدم'' وہ اپنے کسی دوست کو دے چکے ہیں اور مجھ سے کئی بار مذکورہ کتاب کی فرمائش کر چکے ہیں۔ اُن کے علاوہ اور بہت سے احباب جو تصوُّف سے دلچسپی رکھتے ہیں، کتاب کے حصول کے خواہشمند ہیں۔ کتاب کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے دوبارہ چھپوانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مجھے ''اسرارُ القِدم'' کی قدر و منزلت کا اندازہ پی ایچ ڈی کے دوران ہوا کیوں کہ جب میں نے تصوُّف کے موضوع پر کتابیں پڑھیں تو وہ اپنی مشکل زبان کی وجہ سے سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وحدت الوجود، وحدت الشہود، تنزلاتِ ستہ اور تصوُّف کی دوسری اصطلاحوں

Marfat.com

کی صحیح سمجھ ''اسرارُ القِدم'' کو پڑھ کر ہی آئی۔

''اسرارُ القِدم من فصوص الحکم'' ابنِ عربیؒ کی کتاب ''فصوص الحکم'' کا ترجمہ وتشریح ہے مگر یہ کتاب ترجمہ کے بجائے تخلیق لگتی ہے کیوں کہ کتاب کی تخلیق روح کے عطر کو کشید کرنے کا عمل ہے اور ''اسرارُ القِدم'' میں یہ عمل صاف صاف نظر آتا ہے۔ صوفیانہ کتب کے اکثر ترجمے صوفیہ نے ہی کیے اور انھوں نے ترجمے کے ساتھ عارفانہ نکات کی شرح بھی کی ہے۔ جب صاحبِ متن اور مترجم دونوں صوفی ہوں تو ترجمے کا عمل عشق کا عمل بن جاتا ہے۔ مترجم کو صاحبِ متن سے بھی محبت ہوتی ہے اور محبت کے راستے کی تمام تکلیفیں بھی مترجم کو اُٹھانی پڑتی ہیں۔ مترجم کو شرح کرتے وقت اپنی روحانی پرواز کے ساتھ تخلیقی پرواز سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ایسی ہی روحانی و تخلیقی پرواز ہمیں ''اسرارُ القِدم'' میں دکھائی دیتی ہے۔

''اسرارُ القِدم'' کا پہلا ایڈیشن ۱۳۸۷ ہجری میں سامنے آیا۔ اشرف پریس لاہور سے شائع ہونے والی کتاب ۶۳۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کی کتابت محمد شریف کاتب نے کی تھی۔ ''اسرارُ القِدم'' میں علمِ تصوُّف کے بنیادی معارف اور موضوعات ہیں۔ موضوعات کی ترتیب میں منطقی اور استدلالی ربط ہے۔ مذکورہ کتاب کے ذریعے خدا اور بندے کے درمیان رابطوں کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ علومِ باطنی پر مبنی اس بھرپور کتاب میں 'مراد یہ ہے' اور 'یعنی' کی تکرار اس نکتے کی وضاحت کرتی ہے کہ کتاب صرف ترجمہ نہیں بلکہ شرح در شرح ہے۔ مشکل متصوفانہ اصطلاحات کو سلیس اُردو زبان میں ترجمہ وتشریح کے ذریعے آسان بنا دیا گیا ہے مگر پھر بھی کئی مقامات پر مشکل محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ترجمہ اس خامی یا مشکل کا سبب نہیں ہے بلکہ صوفیانہ تجربے کی نزاکت ابہام کی وجہ ہے۔ فصوص الحکم کی زیادہ شروح عربی زبان میں ہیں اور جو اُردو میں ہیں، ان میں پرانی طرز کی اُردو استعمال کی گئی ہے۔ لیکن ''اسرارُ القِدم'' کی تشریح کرتے ہوئے آسان زبان استعمال کی گئی ہے۔ ترجمہ کا کام تصنیف سے بھی مشکل ہے کیوں کہ مترجم کو مصنف کے دل و دماغ اور روح میں بھی جھانکنا پڑتا ہے۔ ''اسرارُ القِدم'' کے مصنف یہ کام بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ صوفی کے فکر وتصور میں سات آسمانوں کی وسعتیں ہوتی ہیں اور اُس کا روحانی تجربہ عام دنیادار کے تجربہ سے مختلف ہوتا ہے اور اُس کی تحریر اُس کی وارداتِ قلبی اور عینی

Marfat.com

مشاہدے کی عکاس ہوتی ہے۔

''اسرارُالقِدم'' کی ضرورت اوراہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ابنِ عربیؒ کی اُس کتاب سے ماخوذ ہے جس کی مسلمانوں کے روحانی افکار کی تاریخ میں اثر اندازی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مدتِ دراز تک فصوص الحکم ایران میں عرفان نظری کی اہم درسی کتابوں میں شمار ہوتی رہی اور بڑے بڑے اہلِ علم اُستاد اعلیٰ سطح پر اس کی تعلیم وتدریس میں مشغول رہے اور فصوص الحکم کی شرحیں کرتے رہے جن کی تعداد محققین کی گنتی کے مطابق سو کو پہنچتی ہے۔ ابنِ عربیؒ کی اس کتاب پر شدید تنقید بھی ہوئی مگر لوگوں نے اس کتاب کی تعریف بھی کی۔ اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص روحانی تجربے سے نہیں گزرتا، اُس کے لیے کسی صوفی کے تجربے کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص دنیا کے آلام ومصائب سے گھبرا کر اپنی روح کو سکون سے آشنا کرنے کے لیے روحانی تجربہ کرتا ہے تو اُسے متصوفانہ تحریروں کی سمجھ آنے لگتی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ فرمایا کرتے:

''میں اگر چاہوں تو برسرِ منبر فصوص پر اس طرح تقریر کر سکتا ہوں کہ اس کے جملہ مسائل کو آیاتِ قرآنی اور احادیث کی روشنی میں ثابت کر دوں اور اس انداز سے بیان کروں کہ کسی کو اس میں شبہ کی گنجایش نہ رہے۔''(۱)

فصوص الحکم کے مصنف ابنِ عربیؒ کے بارے میں:

ابنِ عربیؒ بقول عبدالوہاب شعرانی کتاب وسنت کے پابند تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے ایک لحظہ بھی شریعت چھوڑ دی وہ ہلاک ہو گیا۔ ابنِ عربیؒ کے دوستوں اور دشمنوں دونوں نے اُنھیں زبردست عالم، بزرگ صوفی اور خدا آگاہ عارف کہا ہے اور اُن کی تخلیقی اور اختراعی قوت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ابنِ عربیؒ کا وحدت الوجود کا نظریہ شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کا موضوعِ بحث بنا اور ''فصوص الحکم'' معرفت کی کتابوں میں معتبر ترین قرار پائی۔ ایران کے شارحین ومفسرین نے اُن کے جاندار فلسفے اور سچے عرفان کو اپنے فکر وخیال کے مطابق پایا۔ صدرالدین محمد بن اسحٰق قونوی نے سرزمینِ مشرق میں ان کی حمایت کی سرتوڑ کوشش کی اور اُنہی کی بدولت مشرقی

Marfat.com

سرزمین پر ابنِ عربیؒ کے عرفان نے فروغ پایا۔عراقی اور جامی نے ابنِ عربیؒ سے استفادہ کیا۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی ابنِ عربیؒ کے پیروکاروں میں سے ہیں اور ابنِ عربیؒ کو دین وملت کا احیاء کرنے والا کہتے ہیں۔شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی ابنِ عربیؒ سے متاثر ہیں۔عبدالکریم جیلی بھی ابنِ عربیؒ کی عزت کرتے ہیں۔سلسلۂ سہروردیہ کے بانی شہاب الدین سہروردی ابنِ عربیؒ کو ''حقائق کا سمندر''، مجدّ دالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی ابنِ عربیؒ کو عارفانہ علوم کو نئی زندگی دینے والا قرار دیتے ہیں۔شعرانی اپنی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں اُنھیں ''عارفوں کا سرتاج'' اور جلال الدین سیوطیؒ نے ''عارفوں کا مربی'' کہا ہے۔ابنِ عربیؒ کے مداحوں کی فہرست میں کمال الدین کاشانی، شام کے جلیل القدر عالم حضرت کمال الدین ملکانی، فخرالدین رازی، امام ابن اسعد یافعی اور محمد مغربی شاذلی کے نام شامل ہیں۔

ابنِ عربیؒ کے بعد وجود میں آنے والے تقریباً تمام اہم اور مشہور سلسلوں کے صوفیہ نے ابنِ عربیؒ کو صوفیہ کا شیخِ اکبر مانا اور راہِ طریقت میں اُن کے آداب وقواعد کو ملحوظ رکھا۔سلسلۂ شاذلیہ کے ابنِ عطاءاللہ سکندری، شیخ محمد مغربی شاذلی اور شیخ جلال الدین سیوطی نے ابنِ عربیؒ کی عظمت و بزرگی کی تعریف کی۔سلسلۂ نقشبندیہ کے پیروکاروں نے بھی ابنِ عربیؒ کا نام بڑے ادب واحترام سے لیا ہے۔سلسلۂ قادریہ جلویہ کے بزرگ حضرت غلام محمد جلوآنویؒ اور صوفی عطا محمد قادریؒ بھی ابنِ عربیؒ کی عزت کرتے ہیں اور اپنی کتابوں میں بڑی محبت سے اُن کا نام لکھتے ہیں۔ابنِ عربیؒ سے متاثر ہونے والوں میں دانتے اور علامہ اقبال کا نام بھی آتا ہے۔

ابنِ عربیؒ کے منکر ملا تھے جو محققین کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔ویسے بھی بڑے شخص کی موجودگی دشمن تو پیدا کرتی ہے اور اہلِ علم کو بڑی تکلیفوں کا سامنا رہا ہے اس لیے ابنِ عربیؒ کی مخالفت بھی یقینی تھی اور جب کوئی صفت علم سے متصف ہوتا ہے تو اُس کے مخالفین پیدا ہو جاتے ہیں مگر منکرین کے انکار سے شیخ ابنِ عربیؒ کے کمال میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ابنِ عربیؒ کے مداح امام ابن اسعد یافعی فرماتے ہیں:

> ''جو کوئی اولیا اللہ سے عداوت رکھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے عداوت رکھتا ہے۔''(۲)

Marfat.com

ابنِ عربیؒ کے نظریۂ وحدت الوجود سے اسلام کے بہترین دماغ متاثر ہوئے اور یہ نظریہ تصوُّف کی روح بن گیا لیکن وحدت الوجود پر عوام میں گفتگو کو مشائخ بُرا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ فرمایا کرتے تھے:

''مسئلہ وحدت الوجود کو ہر آشنا و بیگانہ کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے۔''(۳)

شاید اسی لیے ابنِ عربیؒ کی کتابوں کو پڑھنے اور پڑھانے پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ محمد غوثی مصنف ''گلزارِ ابرار'' کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ''فصوص الحکم'' کو پڑھانے کے لیے باقاعدہ سند حاصل کی جاتی تھی۔(۴)

''فصوص الحکم'' کی زیادہ تر شرحیں عربی میں لکھی گئیں تا کہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی استفادہ کر سکے۔ یہ تمام احتیاطیں وحدت الوجود پر ایمان رکھنے والے مشائخ نے کیں کیوں کہ اس نظریے کو سمجھنے کے لیے بالغ نظری اور بیدار مذہبی شعور کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور کے نقاد جیلانی کامران کے خیال میں ابنِ عربیؒ کے نزدیک خدا اور انسان کے باہمی رشتے کا سوال مرکزی ہے۔ خدا انسان کے شعور میں قلبی واردات اور تجربے کے بغیر نہیں آ سکتا۔ خدا کا شعور عشق کے جذبے کی وساطت سے ہوتا ہے۔ انسان اپنی زیست کی تکمیل کے لیے خدا کو تلاش کرتا ہے اور تلاش کی کہانی فلسفۂ عشق بن جاتی ہے۔ ابنِ عربیؒ کے مطابق 'فنا' سے مراد ظاہر کی دنیا کا محو ہو جانا اور ظاہر کے اثرات سے ماورا حقیقتوں کی رونمائی ہے۔ گویا فنا دراصل ظاہر کی دنیا کو محو کر کے خود کو خدا کے روبرو دیکھنے کا نام ہے۔ ابنِ عربیؒ انسان اور خدا کے رشتے کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں اور انسان کو داخلی تجربے اور مجاز کے علم کی مدد سے انسان اور خدا کے درمیان موجود رشتوں کی خبر دیتے ہیں۔ ابنِ عربیؒ کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر اسلامی ہے اور انسانیاتی نکتہ نظر ہے۔ وہ خدا کو ایک ہمہ گیر اور جامع تصور میں سمو کر سارے انسانوں کی رسائی میں پہنچا دیتے ہیں۔(۵)

''اسرارُ القِدم'' ابنِ عربیؒ کے مذکورہ خیالات کی وضاحت کرتی ہے۔ خصوصاً 'وحدت الوجود' اور 'فنا' کی وضاحت آسان الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ ''اسرارُ القِدم'' پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں وحدت الوجود کے سلسلے میں ابہام نہیں رہتا۔ مشائخِ چشت کی

Marfat.com

روحانی فکر کی اساس بھی نظریۂ وحدت الوجود تھا۔ ابنِ عربی ؒ کی تصانیف ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' اُن کے روحانی سفر میں روشن میناروں کی طرح تھیں۔ اس نظریہ کی تائید میں وہ آیاتِ قرآنی پیش کرتے تھے۔ قرآن کی جو تفسیریں مشائخِ چشت نے لکھی ہیں وہ وحدت الوجود کے نظریہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں (۶) حضرت مجدد الف ثانی نے اختلافِ نظریات کے باوجود ابنِ عربی ؒ کے مُنکر کو خطرے میں گھرا ہوا سمجھا ہے۔

''مُنکرِ اُو (ابن عربی ؒ) درخطر است'' (۷)

جاپانی عالم ازوتسو نے ابنِ عربی ؒ کے افکار کا تجزیہ کیا ہے اور قدیم و جدید مذہبی فکر سے مطابقت کی کوشش کی ہے۔

وحدت الوجود کے قائل ''فصوص الحکم'' کو تصوُّف کی اہم کتاب مانتے ہیں۔ اس کتاب میں وحدت الوجود پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ توحید کے بارے میں ابنِ عربی ؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ وجود واحد ہے اور وہی موجود ہے اور مخلوقات کا وجود عین وجودِ خالق ہے۔ اس 'عینیت' کا اثبات یا تو وہ وجودِ عالم کی نفی سے کرتے ہیں یا خدا کے اثبات سے۔ وحدت الوجود کے اس نظریے نے زمانۂ مابعد کے صوفیہ پر بھی گہرا اثر ڈالا اور اُردو کے نامور متصوفین شعرا نے اپنی شاعری میں بھی اس نظریۂ وحدت الوجود کو پیش کیا۔

تاریخِ تصوُّفِ اسلام میں انسانِ کامل کی اصطلاح کو سب سے پہلے شیخ محی الدین ابنِ عربی ؒ نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں استعمال کیا۔ (۸) ابنِ عربی ؒ کے نزدیک تخلیقِ کائنات کی علّت حقیقت محمدیہ ؐ ہے۔ اس حقیقتِ محمدیہ ؐ کو ابنِ عربی ؒ حقیقت الحقائق کہتے ہیں جس کا کامل ترین ظہور انسانِ کامل میں ہوتا ہے۔ انسانِ کامل کائنات کا ایک ایسا خلاصہ ہے جس کی ذات میں خدا کی صفاتِ کاملہ منعکس ہوتی ہیں۔ اس لیے انسانِ کامل ہی دراصل تخلیقِ کائنات کی علّت ہے۔ (۹)

''اسرارُ القِدم'' میں جناب صوفی عطا محمد قادری ؒ لکھتے ہیں کہ عالم کے افراد اللہ تعالیٰ کے مختلف اسماء کے مظاہر ہیں لیکن حضرت انسانِ کامل کی ذاتِ جمیع اسما و صفات کا مظہر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اس میں اپنی ذات اور اپنے اسما و صفات کو دیکھے، لہٰذا انسان

Marfat.com

سرِّ الٰہی ہے۔ اس راز کو پانے والا عارف باللہ اور نہ جاننے والا جاہل ہے۔ ''اسرارُ القِدم'' میں دوسری صوفیانہ اصطلاحات کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو سمجھنے میں آسانی ہو جیسے مراتِ تامّہ، اعیانِ ثابتہ، وحدت و کثرت، ربوبیت و عبودیت اور تجدّدِ امثال کی وضاحت۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''اے لوگو! میں تمھارے نفسوں میں یعنی ذاتوں میں بستا ہوں'' کی شرح کرتے ہوئے صاحبِ ''اسرارُ القِدم'' لکھتے ہیں کہ قالبِ انسانی میں ایک ہی مکین ہے اور وہ رب تعالیٰ ہے۔ اس قالبِ انسانی میں مکین حضرتِ روح ہے۔ یہی انسان کی روح اللہ تعالیٰ کی روح ہے اور مراد یہ ہے کہ اے لوگو! تمھاری صورتوں پر میں متجلی ہوں۔ یہ وہم غیریت ہی درمیان میں حجاب ہے۔ اس وہمِ غیریت کو مٹا دے۔ یہی وہم غیریت یعنی اپنی وہمی ہستی سانپ ہے، اس کو قتل کر دے۔ انسان کو بچپن سے ایک غلط خیال دل میں بیٹھ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جدا ہے اور اللہ تعالیٰ کا غیر ہے۔ اب اس خیال کی نفی خیال ہی سے کرنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جُدا نہیں ہے، لہٰذا فقیری و درویشی صحیح خیال ہے اور کچھ نہیں۔ (۱۰)

میں نے ''اسرارُ القِدم'' سے ایک مثال دی ہے لیکن تصوُّف کی دوسری اصطلاحات کی شرح بھی اسی طرح کی گئی ہے کہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو اور پڑھنے والا حیران رہ جائے کہ اتنی مشکل بات اتنی آسان تھی۔ دراصل ''اسرارُ القِدم'' کے مصنف کے نزدیک عارف کا ادراک جملہ عوالم پر محیط ہے اور ہم اس ادراک کا اظہار ''اسرارُ القِدم'' کے بیشتر صفحات پر دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں جناب عطا محمد صاحب قادریؒ کے مرید و خلیفہ میاں محمد یوسف صاحب کا شکریہ بھی واجب سمجھتی ہوں جنھوں نے ''اسرارُ القِدم'' کے دوسرے ایڈیشن کے سلسلے میں مالی تعاون کے ساتھ ساتھ پروف ریڈنگ کی ساری ذمہ داری بھی قبول کی۔ والد صاحب کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اُن کی دلچسپی اور خلوص قابلِ ستایش ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱) ''انفاس العارفین'' بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت''، جلد اوّل، دہلی: ادارۂ ادبیاتِ دلّی، ۱۹۸۰ء، ص ۴۳۵۔

۲) محمد برکت اللہ لکھنوی، مترجم: مقدمہ ''فصوص الحکم'' لاہور: تصوف فاؤنڈیشن، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۔

۳) ''مکتوباتِ کلیمی'' بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل، دہلی: ادارۂ ادبیات دلّی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۴۱۔

۴) ''گلزارِ ابرار'' (قلمی نسخہ) اُردو ترجمہ، بحوالہ ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل، ص ۱۴۲۔

۵) جیلانی کامران ''تنقید کا نیا پس منظر'' لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱ تا ۴۰۔

۶) پروفیسر خلیق احمد نظامی ''تاریخِ مشائخ چشت'' جلد اوّل، ص ۴۴۸۔

۷) مذکورہ حوالہ، ص ۴۳۸۔

۸) The Encyclopedia of Islam, Vol. 11, P 510.

۹) A.J. Arberry, Sufism, London: 1950, P 100-101.

۱۰) صوفی عطا محمد قادری ''اسرارُ القِدم من فُصُوص الحکم''، لاہور: اشرف پریس، بارِ اوّل، ۱۳۸۷ھ، ص ۴۷۷۔

Marfat.com

ایک صوفی فرمانروا

حضرت عمر بن عبدالعزیز تاریخِ تصوُّف کے دورِ اوّل کے نامور صوفی حضرت حسن بصریؒ کے ہمعصر تھے۔ وہ حضرت حسن بصریؒ کی بہت عزت کرتے اور فرماتے کہ وہ اسلام میں ایک بڑے درجے کے شخص ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت کے ممتاز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خلافتِ راشدہ کے نظم ونسق کو دوبارہ قائم کیا اور اُن کے عہد میں دنیا کو عہدِ صحابہ کی خصوصیات نظر آنے لگیں۔ اُنھوں نے اپنی تمام تر توجہ خلفائے راشدین اور صحابہ کے طریقے کی طرف مبذول کی۔ اُنھوں نے اپنے دور کو خیر اور عدل وانصاف سے معمور کر دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے شاہی سواریاں جس میں خچر اور ترکی گھوڑے تھے، واپس کر دیے اور فرمایا ''میرا خچر میرے لیے کافی ہے۔'' اپنے پہلے خطبے میں لوگوں کو تقویٰ، فکرِ آخرت اور تذکرۂ موت کی طرف توجہ دلائی اور آخر میں بآوازِ بلند فرمایا:

> ''لوگو! جو شخص خدا کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت واجب ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے اس کی فرماں برداری جائز نہیں..... جب تک میں خدا کی اطاعت کروں میری اطاعت کرو اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میری فرمانبرداری تم پر فرض نہیں ہے۔''(۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے لوگوں کا مال اور جائیداد واپس دلائی جو خلفائے بنوامیہ نے قبضے میں لے لی تھی۔ اُنھوں نے ابتدا اپنی ذات اور اپنے خاندان سے کی۔ باغِ فدک کو اُسی حالت میں لوٹایا جو حالت عہدِ رسالت میں تھی۔ حقوق کی واپسی کے لیے کسی قطعی شہادت یا حجت کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو شخص دعویٰ کرتا تھا، معمولی سے معمولی ثبوت پر اُس کا مال

Marfat.com

واپس مل جاتا تھا۔اپنی اولاد کے لیے صرف ۱۲ دینار چھوڑے۔خلافت سے پہلے امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر خلیفہ ہونے کے بعد نئے قالب میں ڈھل گئے۔کپڑوں میں پیوند لگے رہتے تھے، گھر میں کسی قسم کا ساز وسامان نہ تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز بہت خدا ترس انسان تھے۔اُنھوں نے باوجود خلیفہ ہونے کے کبھی اپنے آپ کو عام مسلمانوں بلکہ لونڈی غلاموں سے بھی بالاتر نہیں سمجھا۔ایک دن لونڈی اُن کو پنکھا جھل رہی تھی کہ اُسی حالات میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔انھوں نے خود پنکھا لے لیا اور اُس لونڈی کو جھلنے لگے۔وہ جاگی تو اُس نے شور کیا۔بولے تو بھی میری طرح ایک آدمی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز میں توکّل اتنا زیادہ تھا کہ اپنے پہرہ داروں سے صاف صاف کہ دیا کہ میں تم سے بالکل بے نیاز ہوں۔تقدیرِ الٰہی میری حفاظت کے لیے کافی ہے۔تم میں جس کا جی چاہے رہے، جس کا جی چاہے چلا جائے۔دشمنوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت نرم تھا۔ عبادتِ شبانہ کے لیے گھر میں ایک حجرہ مخصوص کرلیا تھا جس میں کمبل کے سلے ہوئے کپڑے رکھے رہتے۔جب رات کا پچھلا پہر ہوتا تو دن کے کپڑے اتار ڈالتے اور ان کپڑوں کو پہن کر مناجات اور گریہ و بکا میں مصروف ہو جاتے اور صبح تک مصروف رہتے۔جب صبح ہوتی تو ان کپڑوں کو تہ کر کے صندوق میں رکھ دیتے۔ادائے نماز میں بالکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنن وآداب کا اتباع کرتے تھے۔حضرت انس بن مالکؓ کا قول ہے کہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔قرآن مجید کو سن کر ان پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔جن آیات میں قیامت کا ذکر ہوتا، پڑھتے تو بے ساختہ رو پڑتے، بے ہوش ہو جاتے اور صبح تک ان پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری رہتی۔ (۲)

تاریخِ تصوُّف کے دورِ اوّل میں صوفیہ میں حُزن اور خوف کے جذبات نظر آتے ہیں اور اُن کے دل خشیتِ الٰہی سے لرزتے تھے۔عام طور پر جاہ و دولت انسان کے دل کو خدا سے غافل کر دیتے ہیں لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دل خلافت کے باوجود خوفِ خدا کا آشیانہ تھا۔چناں چہ ایک بار انھوں نے خود اپنے ایک فوجی افسر کو لکھا کہ خدا کی عظمت اور خشیت کا سب سے زیادہ مستحق بندہ وہ ہے جو اس مصیبت میں مبتلا ہو جس میں کہ میں ہوں۔خدا کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت

Marfat.com

حساب دینے والا کوئی نہیں۔ نمازِ عشاء کے بعد بیٹھ کر دعائیں کرتے اور روتے جاتے یہاں تک کہ آنکھ لگ جاتی پھر آنکھ کھلتی تو یہی مشغلہ جاری رہتا۔ غرض تمام رات اس طرح گزر جاتی۔ (۳)

امراء اور سلاطین کے یہاں راتوں کو بزمِ عیش وطرب منعقد ہوتی ہے لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے یہاں رات کو فقہا جمع ہو کر موت اور قیامت کا ذکر کرتے تھے اور اس طرح روتے تھے گویا ان کے سامنے جنازہ رکھا ہوا ہے۔ (۴)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نظامِ حکومت کی بنیاد خوفِ خدا پر قائم تھی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے ڈر، قیامت کے مواخذہ اور موت کے خوف سے کرتے تھے۔ روزِ قیامت سے نہایت خائف رہتے تھے۔ قیامت کے علاوہ ان کو دنیا ہی میں ہمیشہ عذابِ الٰہی کا خوف لگا رہتا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اجزائے ایمانیہ میں سب سے نمایاں پہلو محبتِ رسولؐ تھا۔ ایک صحابی کے خاندان کے پاس حضور نبی کریمؐ کی جاگیر کے متعلق لکھی ہوئی سند تھی۔ اس صحابی کے خاندان کے ایک شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو وہ سند دکھائی تو اُنھوں نے اس کو چوم کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ (۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی حکومت کا ستون روحانیت کو بنایا اور اُن کے خلیفہ ہونے پر باہمی ملاقات میں ایک شخص دوسرے سے کہتا تھا کہ رات کو تم کون سا وظیفہ پڑھتے ہو؟ تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے؟ تم قرآن کب ختم کرو گے اور کب ختم کیا تھا اور مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسلامی عقائد واعمال کے تحفظ و بقا کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیا۔ حجاج نے زکوٰۃ کا نظام خراب کر دیا تھا۔ عمال کو اس روش سے اجتناب کی ہدایت کی اور خلافِ شریعت باتوں سے دور رہنے کی ہدایات جاری کیں۔ رفاہِ عام کے کام کیے اور کثرت سے سرائیں بنوائیں۔ خلیفہ بنتے ہی حضرت عمر بن خطابؓ کے نقشِ قدم کو چراغِ راہ بنایا۔ سالم بن عبداللہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں چاہتا ہوں کہ رعایا کے معاملے میں حضرت عمر بن خطابؓ کی روش اختیار کروں بشرطے کہ یہ خدا کو منظور ہو اور میں اس پر قادر ہوں۔ آپ

Marfat.com

میرے پاس حضرت عمرؒ کی تحریریں اور اُن کے فیصلے جو انھوں نے
مسلمانوں اور ذمّیوں کے متعلق کیے ہیں، بھیج دیجیے۔ اگر خدا کو منظور ہوگا
تو میں ان کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔''(۷)

اس روش کو اختیار کرنا اُن کے زمانے میں آسان نہ تھا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنا نظامِ حکومت اُسی بنیاد پر قائم کیا جس پر عہدِ خلافتِ راشدہ میں قائم ہو چکا تھا اور اسی بنا پر بعض محدثین نے ان کو اُسی سلسلے کی ایک کڑی خیال کیا ہے۔

حواشی

۱) مولانا عبدالسلام ندوی، ''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور: اسلام آباد، راولپنڈی، ملتان، پشاور، کوئٹہ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۔

۲) ایضاً۔ ص ۸۴۔

۳) ایضاً۔ ص ۸۵۔

۴) ایضاً۔ ص ۸۶۔

۵) ایضاً۔ ص ۸۹۔

۶) ایضاً۔ ص ۱۱۳۔

۷) ایضاً۔ ص ۱۳۰-۱۳۱۔

Marfat.com

تصوّف اور ادب
کا
باہمی رشتہ

ڈاکٹر نفیس اقبال

297.6
ن 73 ت
144682

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

Marfat.com